پھول جیسے لوگ

"پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ یہ چہرہ ایک دُنیادار بزنس مین کا چہرہ تھا۔ بالکل علی اپنی لڑکی کو وہ پورے کاروباری ذہن سے فلموں میں لانے کے لئے کوشاں تھا۔ وہ پہلے ہی حساب لگا چکا تھا کہ اگر اس کی لڑکی کامیاب ہو گئی تو وہ لاکھوں روپے بنا لے گا۔ اور لڑکی تو اس کے زیرِ نگر تھی ہی۔ لڑکی کی اہمیت اُس کے نزدیک ایک سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو ہر چیز کو انوسٹمنٹ کے حساب سے سوچتا تھا۔ جذباتی رشتے اُس کے نزدیک بے معنی ہو چکے تھے۔ اُس کی لڑکی ایک پروڈکٹ تھی جسے بازار میں چلانا تھا۔"

—— اِسی ناول سے

تخلیق کار پبلیشرز کی آئندہ اشاعتیں

- نیلام گھر (ناول) مشرف عالم ذوقی
- دھند سے گھرا مکان (افسانے) ولی محمد چودھری
- گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے) علی امام نقوی
- لمحوں کی قید (افسانے) کشور سلطانہ
- ڈاکو طے کریں گے (افسانے) م۔ ناگ
- دو زاویے (شعری انتخاب) انیس امروہوی
- وہ بھی اک زمانہ تھا (فلمی شخصیات) انیس امروہوی
- قفسِ رنگ (غالب کی حیات و فن کا مطالعہ) سید قدرت نقوی
- عظمتِ غالب (غالب کے فکر و فن کا مطالعہ) سید قدرت نقوی

تخلیق کار پبلیشرز

۷۰۴، فراش خانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ناول

انور خان

تخلیق کار پبلشرز
۴۰۴، فراشخانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ناول : پھول جیسے لوگ
مصنف : انور خان
قیمت : چالیس روپے
سن اشاعت : ۱۹۹۰ء
ناشر : تخلیق کار پبلشرز
۴۰۷، فراش خانہ دھلی ۱۱۰۰۰۶
بہ اہتمام : انیس امروہوی
سرورق : آصف خان
تقسیم کار : رچنا کار پروڈکشنز، ۴۰۰، فراش خانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ملنے کا پتہ :

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دھلی ۲

مطبوعہ : کمار آفسیٹ پرنٹرز، دھلی
کتابت : حبیب الرحمان

TP:01 TAKHLEEQKAR, DELHI
KHAN, ANWAR - 1990
PHOOL JAISE LOG (NOVEL) PRICE : RS. 40.00

ایک

فوزیہ کے ذکر کے ساتھ ہی میرا ذہن اُس شام کی طرف لوٹ جاتا ہے جب شاید پہلی بار میں اُس کے وجود سے آگاہ ہوا تھا۔ فوزیہ میری خالہ زاد بہن۔ بچپن سے میں نے اُسے سینکڑوں ہی بار دیکھا ہوگا مگر اس شام جیسے میں پہلی بار اُسے دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی لڑکیوں سے میری طبیعت اُلجھتی تھی۔ اُن کی دنیا اور ہماری دنیا اور لڑکیوں سے آخر آدمی کیا بات کرے؟ مگر اُس روز فوزیہ نے مجھے چونکا دیا۔ گھر معلوم ہوتا تھا لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں میدان سے تھکا ماندہ لوٹا تھا۔ شنو خالہ نے مجھ سے کچھ رسمی سی باتیں بھی کیں۔ مگر اس خیال سے کہ سب لڑکیوں کا دھیان میری طرف ہے۔ میرے کانوں کی لویں گرم ہو رہی تھیں۔ پتہ نہیں انھوں نے کیا پوچھا اور میں نے کیا جواب دیا دل میں اس قدر زوروں سے دھڑک رہا تھا کہ

باوجود خواہش کے میں فوزیہ کی طرف دیکھنے سے معذور رہتا۔ بڑی
دیر بعد میں اس قابل ہوا کہ کنکھیوں سے اسے دیکھ سکوں۔ دبلے
پتلے۔ چھریرے بدن کی، گوری گوری شربتی آنکھوں والی۔ لمبے قد
کی یہ لڑکی اس وقت مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتی۔
دو ایک بار اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایسے لگا جیسے کسی نے
دل کو مسل دیا۔ پورے بدن میں بجلی دوڑ گئی۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک اور تصویر میں فوزیہ مجھے دلہن کے
سرخ لباس میں نظر آتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہال پھولوں اور قمقموں
سے سجا ہے۔ فلمی گیت بج رہے ہیں۔ میں دروازے پر کھڑا مہمانوں
کا استقبال کر رہا ہوں۔ پھولوں سے سجی ایک کار آکر رکتی ہے۔
اس میں سے دو تین عورتیں باہر آتی ہیں۔ اندر فوزیہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔
عورتیں سہارا دے کر اسے باہر لاتی ہیں۔ بس اس کے بعد میرے
سر میں دھماکے سے ہونے لگتے ہیں اور میں اندھیرے میں ڈوبتا
چلا جاتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اس تصویر
سے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ یہ تصویر کم کم ہی میرے
سامنے آتی ہے۔ بلکہ خود فوزیہ کا عکس میرے سامنے کبھی جلدی
نہیں آتا، جیسے میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ اس اندھیرے
سے پہلے کی زندگی میں بھی میں نے اسے کم کم ہی یاد کیا ہوگا۔ اگرچہ
ایسا بھی نہیں کہ وہ اس شام کے بعد میرے ذہن سے کبھی مکمل طور پر
فراموش ہوئی ہو۔ شاید اس لئے کہ خالہ زاد بہن ہونے کی وجہ سے وہ
مجھے کبھی اپنی دسترس سے باہر نہیں معلوم ہوئی یا اپنے خاندان میں جو

اہمیت مجھے حاصل رہی اُس کی وجہ سے میں سمجھا تھا کہ فوزیہ پر بس میرا ہی حق ہے۔

اس وقت میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ ایک پُرسکون اندھیرا۔ میں نجانے کس جگہ ہوں۔ ایک ایسی جگہ جہاں جسم کا احساس ہی نہیں۔ نہ ہاتھ نہ پیر، نہ آنکھیں۔ میں خود کو ٹٹولنا چاہتا ہوں مگر نہیں ٹٹول سکتا۔ میں خود کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر یہ تصویریں کون دیکھ رہا ہے؟ مجھے اپنے ہونے کا احساس تو ہے۔ ظاہر ہے یہ تصویریں میں ہی دیکھ رہا ہوں۔ کہیں یہ خواب تو نہیں ہو سکتا ہے خواب ہی ہو یا محض تصور۔ بہرحال یہ تصویر ہو یا خواب ہو یا تصوّر۔ یہ میں ہی ہوں جو انہیں دیکھ رہا ہوں یا سوچ رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بہت عجیب معلوم ہوتا ہے کہ بغیر جسم کے میں دیکھتا بھی ہوں۔ محسوس بھی کرتا ہوں اور سوچتا بھی ہوں۔ ان تصویروں کا مجھ پر شدید ردِّ عمل ہوتا ہے۔ کبھی میں خوش ہو جاتا ہوں اور کبھی انگاروں پر لوٹنے لگتا ہوں۔ پچھتاتا ہوں۔ جھنجھلا جاتا ہوں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ یہ تصویریں بند ہو جائیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو اسی وقت بند کر دوں۔ مگر ان پر میرا بس نہیں چلتا۔ بغیر کسی ربط کسی ترتیب کے، جیسے فلم کی سلائڈ دکھائی جاتی ہے۔ کبھی ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی فریم سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی اس قدر آہستہ کہ ان میں آپس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی کوئی سلائڈ ٹھہر جاتی ہے اور گھنٹوں — مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے — ٹھہری رہتی ہے۔

ان تصویروں کا اب میں عادی ہو گیا ہوں جیسا کہ مغربی ملکوں کے لوگ کہا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن سے چپکے رہتے ہیں جب کبھی یہ تصویریں غائب ہو جاتی ہیں اور دیر تک مکمل اندھیرا چھایا رہتا ہے تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ جب ایسی تصویریں میں دیکھتا ہوں جن سے مجھے بڑی شدید اذیت ہوتی ہے تو جی یہی چاہتا ہے کہ ان تصویروں کو روک دیا جائے بلکہ مٹا دیا جائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ مگر اب ان کا نہ ہونا بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

یہ جاوید بھائی اپنے اشعار سنا رہے ہیں۔ شہلا کسی بات پر کھل کھلا کر ہنس رہی ہے۔ فوزیہ کی جھکی جھکی شرمیلی نگاہیں حسب عادت لمحہ بھر کے لئے کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی ہیں پھر جھک جاتی ہیں۔ اس کی یہ ادا کتنی پیاری لگتی ہے۔ درختوں پر پودوں میں لگے پھول، شاخوں پر بیٹھے پرندے مجھے ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی تو ایک چھوٹا سا آشیانہ ہے۔ یہ شہلا کیمرے کے سامنے کھڑی ہے۔ موہن کمار کے اسٹوڈیو میں کتنی اچھی، کتنی معصوم اور کتنی نڈر، میری بہن مگر مجھ سے کس قدر مختلف۔

امی کی یہ نگاہیں، اُف، کتنی محبت ہے ان میں اور امی ہی کیوں آپا شہلا سب ہی کس قدر چاہتے ہیں مجھے۔ سب کی نگاہیں میرے اردگرد طواف کرتی رہتی ہیں۔ جیسے میں ہی ان کی زندگی کا محور ہوں۔

تصویریں غائب ہو گئیں۔ ایک بار پھر اندھیرا ہے اور میں ہوں۔ مگر عجیب بات ہے، یہ اندھیرا کھلتا نہیں۔ اچھا معلوم

ہوتا ہے۔ نہ یہاں وقت کا احساس ہے نہ جسم کا، وقت کی گردش
سے الگ، اس اندھیرے میں آخر ایسی کیا بات ہے؟ امی، شہلا
جاوید بھائی، فوزیہ کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ بس ان کی تصویریں
میرے سامنے سے گزرتی ہیں مگر پتہ نہیں کیوں، ایسا محسوس ہوتا
ہے جیسے یہ سب یہیں کہیں ہیں۔ میرے آس پاس، اندھیرے میں
مجھے ان کے کھو جانے کا کوئی ڈر نہیں۔ بچپن میں ایک بار پہلے بھی
شہلا کھو گئی تھی تو ہم سب کس قدر پریشان ہوئے تھے۔ ابا کے
چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ امی کی سسکیاں روکے نہیں
رکتی تھیں۔ میں پورے میلے میں اس کا نام پکارتے، چلاتے
ہوئے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ پھر جب میں نے ایک جگہ بھیڑ میں اسے
تنہا کھڑے دیکھا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں تھیں
تو میرے دل کو جیسے کسی نے جکڑ لیا تھا۔ میں نے اسے لپک کر
اٹھا لیا تھا اور ہمارے ڈر کے وہ مجھے ایسے چپکی تھی کہ پھر امی کے
پاس پہنچنے کے بعد ہی اس کے چہرے پر ہنسی کا شائبہ نظر آیا تھا۔
اب مجھے ایسا کوئی خوف نہیں، سب ایسا لگتا ہے جیسے میرے پاس
ہی ہیں۔ کوئی انہیں نہیں چھین سکتا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا
ہے جیسے امی مجھے پکار رہی ہیں۔

سعید بیٹے ـــ؟

جی امی۔

واپس آجاؤ میرے بیٹے، ہم سب تمہاری راہ دیکھ رہے
ہیں۔

نہیں امی، میں یہاں بہت خوش ہوں، بہت خوش۔
تمہیں اندھیرے میں ڈر نہیں لگتا۔
نہیں امی، یہ اندھیرا نہیں۔ یہ تو سکون کی لہریں ہیں، جو مجھے لپیٹے ہوئے ہیں۔
آؤ بیٹے، ہم سب تمہیں لینے آئے ہیں۔
مگر میں واپس نہیں جانا چاہتا یہاں میں بہت خوش ہوں۔

دو

اس علم نے بھی مجھے بہت حیران کیا ہے۔ خالی گول پوسٹ اور میں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ہمارے اسکول کا [illegible] میچ تھا۔ مقامی اسکول چمپئن شپ کا فٹ بال فائنل۔ میں ہمیشہ کی طرح فل بیک کی پوزیشن پر کھیل رہا تھا۔ کسی کھلاڑی کے پیر سے گیند لگ کر میرے پیروں میں آئی اور میں لپک کر آگے بڑھا کہ گیند کو محفوظ جگہ لے جا کر اپنے کسی ساتھی کھلاڑی کو بڑھا دوں مگر کچھ ایسا ہوا کہ میدان خالی دیکھ کر میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ شاید کسی کو بھی یہ توقع نہ تھی۔ مقابل کھلاڑی اس بات کے منتظر تھے کہ میں گیند ادھر بڑھاتا ہوں مگر میں بس آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور اس وقت چونکا جب میں نے دیکھا کہ گول کیپر آگے بڑھ آیا۔ شاید اس کے اعصاب بھی جواب دے چکے تھے کیونکہ تناؤ کے

اِس لمحے میں اس نے میرے پیروں پر چھلانگ لگائی اور اسی لمحے میں
نے گیند کو پیر کے ہلکے سے اشارے سے آگے بڑھا دیا۔ اب گول کیپر
زمین پر تھا۔ سامنے خالی گول پوسٹ اور گیند میرے پیروں میں۔ پورا
میدان گونج رہا تھا۔ گول کے پیچھے سے جانے پہچانے چہرے مارے
خوشی کے پاگل ہو رہے تھے۔ اور میں حیران! ہیں، فل بیک یہاں
تک کیسے آگیا۔ ہاتھ پیر پھول گئے۔ سارا شور ذہن سے محو ہو گیا۔ بس
سامنے گول پوسٹ تھا، گیند میرے پیروں میں تھی اور درمیان
میں سناٹے کی دبیز دیوار۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا اور اس کے ساتھ
سارے تماشائی سارے کھلاڑی یہاں تک کہ ریفری بھی۔ قریب
تھا کہ وہ لمحہ گزر جاتا کہ پیچھے سے ہمارے کپتان منیر نے چیخ کر
مجھ سے کہا سوچتا کیا ہے گیند کو مار دے جالی میں۔ اسی آواز
کی طاقت میرے پیر حرکت میں آئے اور گیند جالی میں تھی۔ چشم
زدن کی بات تھی ورنہ مخالف کھلاڑی مجھ تک پہنچ ہی چلے تھے۔
وہ سچویشن آج بھی مجھے ہانٹ کرتی ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں
معلوم ہوا کہ خالی گول کے سامنے کھلاڑیوں کی کیا حالت ہوتی ہے
حالانکہ تماشائیوں کے نزدیک۔ تو یہ سب سے آسان کام ہے۔

اس عکس کا یقیناً میری زندگی سے یا جن واقعات کو میں یاد
کرنا چاہتا ہوں ان سے بہر طور کوئی گہرا تعلق ہے یہ اس وقت سمجھ
آئے گا جب میں تمام تصویروں کو صحیح ترتیب سے دیکھوں۔ فلمیں
دیکھنے کا مجھے بچپن سے شوق رہا۔ سکول سے بھاگ کر میں نے کتنی
فلمیں دیکھی ہیں۔ سینما ہال میں جیسے ہی اندھیرا ہوتا ایک عجیب

سنسنی آمیز حسرت کا احساس ہوتا۔ اور راحت کا بھی کہ میں باہر
کی دنیا، اس کے اندیشوں سے بالکل کٹ جاتا۔ اس وقت بھی
مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ بار ایک، اور عکس اب میرے سامنے
نمایاں ہو گیا ہے۔

جولائی کی تیز بارش، ایروز سینما کے باہر دو [illegible] میں جیسے
ہم تین ہم جماعت، سینما کی قطار ٹکٹ کی کھڑکی کھلنے کے منتظر۔ شاید
گریگری پیک کی کوئی فلم تھی۔ ایک جوتا پالش کرنے والے لڑکے کو
جو بابک کی خاطر قطار میں آگے گھسنے کی کوشش کر رہا تھا ہم نے دھکا
دے دیا تھا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھا تھا اور ہم نے
اُسے دو چار ہاتھ لگا دیے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے گیا،
ادھر ٹکٹ کی کھڑکی کھلی اور ہم لوگ ٹکٹ لے کر سینما ہال میں۔ کیا اڈونچر
تھے۔ فلم دیکھتے ہوئے یہ خیال برابر رہا کہ باہر دوسرے پالش
والے بھی جمع ہو رہے ہوں گے۔ انٹرول میں وہ لوگ ہال میں گھسے
تھے مگر ہم نے بھیڑ میں چہرے چھپا لیے تھے۔ فلم ختم ہوتے ہی پہلے سے
طے شدہ منصوبے کے مطابق ہم مختلف دروازوں سے نکلے تھے
اور جو بس سامنے نظر آئی اُس میں چڑھ گئے تھے۔ اتفاق سے جس
بس میں میں چڑھا تھا، وہ فوزیہ کے گھر کے پاس سے گزرتی تھی۔
عجیب دور تھا۔ وہ بھی رات کے ساڑھے بارہ بجے میں فوزیہ کے
گھر کے پاس اُتر گیا تھا۔ اُس کا گھر دوسرے منزلے پر تھا۔ بتی جل
رہی تھی۔ اُس وقت بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ اسٹریٹ لیمپ
کی روشنی میں کھڑا میں سوچ رہا تھا کہ ضرور فوزیہ جاگ رہی ہوگی

شاید ہوم ورک کر رہی ہو یا ناول پڑھ رہی ہو۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک۔
میں اسی طرح کھڑا رہا اور موسلا دھار بارش میں یہ سوچ کر لطف
لیتا رہا کہ اوپر فوزیہ جاگ رہی ہے اور یہاں میں اتنے نزدیک اس
بھیگے موسم میں اسٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہوں، عجیب
مسرت تھی جو سارے جسم کو شرابور کئے دے رہی تھی۔ شاید میں رات
بھر کھڑا رہتا۔ اگر سناٹے کو چیرتی شنو خالہ کی تیز پاٹ دار آواز
مجھ تک نہیں پہنچتی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ارے لڑکی، اب سوئے گی بھی یا ساری رات ناول ہی پڑھتی
رہے گی۔"

تو فوزیہ ناول پڑھ رہی تھی۔ ضرور جاسوسی دنیا پڑھ رہی
ہو گی۔ ابھی چار دن قبل ہی تو میں نے شہلا کو "چیختے بادل" دی تھی
کہ پڑھ کر فوزیہ کو دے دینا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں وہی
کتاب تھی جو چار روز قبل سارا دن میرے ہاتھوں میں رہی تھی —
کیسی کیسی ۔۔۔ عجیب سی خوشیاں تھیں۔

مگر یہ فوزیہ پھر سرخ لباس پہنے میرے سامنے ہے۔
اور میرے سر میں دھماکے ہونے لگے ہیں۔ فوزیہ —— فوزیہ
فوز —— زیہ —— فو۔

اب پھر اندھیرا ہے۔ مکمل اندھیرا۔ مگر میں جاگ رہا ہوں
مجھے نیند کیوں نہیں آتی۔ شاید جس جہاں میں اس وقت ہوں
وہاں نیند کا گزر ہی نہیں۔

تین

یہ چندر کانت ہے - انجینئر۔ اس کی بیٹی شانتا ڈانسر ہے فلموں میں کام کرنا چاہتی ہے۔ موہن کمار نے مجھے شانتا کو لینے کے لئے چنا ہے۔

"ہم ہندوستانی بڑے قدامت پسند ہیں۔" چندر کانت مجھ سے کہہ رہا ہے "ہم بڑی دیر میں بدلتے ہیں۔ اب زمانہ کافی بدل گیا ہے۔ جنس کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بھی زندگی کا بہت لطف اٹھایا ہے اور جس سوسائٹی میں ہم رہتے بستے ہیں، اس میں بھی اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میری لڑکی بھی اس کو مانڈ نہیں کرتی۔"

میں چندر کانت کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ یہ ایک دنیا دار بزنس مین کا چہرہ ہے۔ بالکل عملی۔ وہ شاید پہلے ہی حساب لگا چکا ہے کہ اگر اس کی لڑکی کامیاب ہو گئی تو وہ لاکھوں روپے بنا لے گا۔ لڑکی کی اہمیت اس کے نزدیک سونے کا انڈہ دینے والی مرغی سے زیادہ نہیں۔ جذباتی رشتوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی لڑکی ایک پروڈکٹ ہے جسے بازار میں چلانا ہے

شانتا کمرے میں داخل ہوتی ہے اور میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی ہے۔ اتنے قریب سے اس کے خد و خال کس قدر

مختلف نظر آتے ہیں۔ بالکل پختہ عورت معلوم ہوتی ہے۔ جنس ناآشنا تو یقیناً نہیں۔

چار

ذہن کے روشن اسکرین پر تصویریں ابھرتی ہیں اور گزرتی چلی جاتی ہیں کبھی تیزی سے کبھی رُک رُک کر۔ پھر خود بخود غائب بھی

ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہونے کا احساس بھی غائب ہو جاتا ہے۔ پھر ذہن اچانک روشن ہوتا ہے تو خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے میں کہاں تھا۔ کیا سوچ رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور تصویریں ذہن میں ہجوم کر دیتی ہیں۔

یہ شہلا ہے۔ میری چھوٹی بہن۔ یہ اس کے بچپن کی تصویر ہے۔ ہر وقت میرے پیچھے بھیا بھیا کہتی دوڑا کرتی تھی۔ گڑیا جیسی کھلتا ہوا گیہواں رنگ۔ اس کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پتہ نہیں کہاں کہاں سے نئے ڈیزائن کے فراک لایا کرتا تھا۔ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا بے ساختہ گود میں اٹھا لیتا۔ کوئی چاکلیٹ دلا دیتا۔ کوئی کمپلیمنٹ۔ بڑی بہن اسے کچھ کہتیں تو مجھے کتنا برا معلوم ہوتا تھا۔ شام میں اسکول سے لوٹتا تو اکثر کمرے کی دہلیز پر بیٹھی انتظار کر رہی ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی کلکاریاں مارنے لگتی۔ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ میں اسے گود میں اٹھا لیتا، پیار کرتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چاکلیٹ سے بھر دیتا۔ ماں بہنوں کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ میں جو ہر ایک سے دور دور کھڑا رہتا تھا کہ کہیں میرے بے داغ سفید کپڑے شکن آلود نہ ہو جائیں۔ اس طرح بے پروائی سے شہلا کو کیسے گود میں اٹھا لیتا تھا۔ اور یہ واقعہ تھا۔ میری نفاست سے کون متاثر نہیں ہوتا تھا۔ کلاس میں استاد کاپیاں لوٹاتے تو کھل کر میری کاپی کی تعریف کرتے۔ بڑی بڑی دوا ساز اور ہوائی کمپنیوں کے لاجواب دبیز سفید کاغذ پر چھپے کیلنڈروں کی شاندار تصویروں سے میں اپنی کاپیوں کو مزین کرتا۔ تحریر

ایسی گویا نگینے جڑے ہوں۔ اُردو کے اُستاد تو میرے چھوٹے چھوٹے فقروں اور روزمرہ ٹکسالی اُردو کو بھی بہت سراہتے تھے۔ اپنی تعریف سُن کر مجھے خوشی کیسے نہ ہوتی۔ یہ خوش گوار لمحے میں بار بار یاد کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ذہن پہ میرا بس کہاں۔؟ میں ایک ایک لمحے کو ٹھہر ٹھہر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ خاص کر مسرت کے لمحوں کو۔ ان لمحوں کو بار بار لوٹانا چاہتا ہوں۔ یہ تصویر میری اسکول کے دنوں کی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوں۔ ابھی ابھی ہم ہوٹل میں داخل ہوئے ہیں۔ میرے دوستوں نے داخل ہوتے ہی اپنے حسب پسند ایک میز پر ڈیرا ڈال دیا ہے۔ مگر میں سیدھے وہاں گیا ہوں۔ جہاں آئینے لگے ہوئے ہیں۔ بار بار آئینے میں دیکھ کر اپنے بال درست کر رہا ہوں۔ ہوٹل کا ایک ملازم بڑبڑا رہا ہے۔ مگر میں نے اُسے ڈانٹ دیا ہے۔ وہ بھی گھبرا کر چپ ہو گیا ہے۔ ان اسکول کے لڑکوں کے کون منہ لگے۔ سرِعام کسی کی بھی ٹوپی اُتار لیں۔ یہ پھر شہلا کا چہرہ سامنے آگیا ہے۔ اُس کی شبیہ دیکھ کر میں خود سے ہنس پڑتا تھا۔ من سے جیسے خوشی کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔ حالانکہ مجھ سے وہ بمشکل پانچ سات سال چھوٹی ہوگی۔ اس کا ننھا سا چہرہ سامنے آتا ہے تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے' دل میں ہ ــــ پتہ نہیں مجھے کیا کہنا چاہیئے۔ وہ جب اسکول جانے لگی تھی تو میں نے کتنی محنت سے اُسے الف، ب کی پوری تختی یاد کروائی تھی۔

چوتھے درجے میں پہنچنے تک تو اُسے میں نے کئی نظمیں یاد

کہ وادی تھیں۔ تم ندی پر جا کر دیکھو۔ جب ندی میں ہنا نے چاند آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ، وہ باغ کی بہاریں، چڑیوں کا چہچہانا، جگنو کی روشنی ہے کا شانہ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پریوں کی انجمن میں "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" اور ایسی کتنی ہی نظمیں تھیں۔ گھر میں جب بھی کوئی مہمان آتا ہم بڑے فخر سے اسے شہلا کی زبانی یہ نظمیں سنواتے شہلا کچھ شرماتی، کبھی میری گود میں منہ چھپاتی پھولی پھولی سانسوں میں جلدی جلدی نظمیں سناتی چلی جاتی۔

یہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کلینک پر جا رہا ہوں۔ سویرے سویرے توشہ دان ہاتھ میں لیے، بغل میں تھرماس لٹکائے جس میں گرم گرم چائے امی نے ڈال دی ہے۔ امی نے کتنے سویرے اٹھ کر میرے لئے روٹیاں ڈالی ہوں گی۔ اور قیمے کا سالن تو انہوں نے رات ہی میں سونے سے پہلے بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ باہر نکلنے تک پتہ نہیں وہ کیا کیا پڑھ کر مجھ پر دم کرتی رہی تھیں۔ اور میں بے چینی سے جلد از جلد اپنے ساتھیوں میں پہنچنے کے لئے بے قرار کرکٹ کے کھلاڑی کی ٹوپی ــــ بڑے بانکپن سے آگے کو جھکائے، پالش کئے ہوئے جوتوں میں میں سڑک پر دوڑتا چلا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ساتھیوں نے ہُو کی صدا لگائی تھی اور میں نے داہنا ہاتھ لہرا کر ان کے خیر مقدم کا جواب دیا تھا۔ کتنے پیارے خوبصورت دن تھے بے فکری کی ساعتیں، معصوم زمانے،

چھوٹی چھوٹی حسین مسرتیں، دوستوں کے ہمگھٹے، چائے خانوں کی غپ شپ۔ گلی کے نکڑ پر اسکول سے لوٹتی ہوئی خوبصورت لڑکیوں کا انتظار، دبی دبی مسکراہٹیں، دزدیدہ سلام، اسکول سے بھاگ کر سستے درجے میں فلمیں دیکھنا۔ سارا شہر بس اپنی طرح مستی میں نہایا معلوم ہوتا تھا۔ رات میں چراغاں ہوتا تھا تو اپنے لئے سارے تہوار ہمارے لئے تھے اور ہر جشن پر میلے ٹھیلے کی رونق ہم سے۔ ماؤنٹ میری یا ماہم کی درگاہ پر میلہ لگتا تو ہفتوں پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ گھر پہ تقاضے شروع ہو جاتے۔ ہر شام نوجوانوں کی ٹولیاں بن سنور کر نکل پڑتیں۔ بے مقصد چھیڑ چھاڑ، دھکا مکی۔ بے ضرر نظر بازیاں کسی نے مسکرا کر دیکھ لیا تو کھل اٹھے پھر کوئی اور حسین نظر آیا تو اسے بھی بھول بھال گئے۔ مٹھائیاں چکھی جا رہی ہیں۔ کباب کھائے جا رہے ہیں۔ لڑکیوں کا کوئی گروپ ہنڈولے پر بیٹھا ہے تو خود بھی بیٹھ گئے ہیں سمندر کے کنارے منڈیر پہ بیٹھے کورس میں پھٹی ہوئی آوازوں میں فلمی گیت گائے جا رہے ہیں۔ سگریٹ پینے کا نیا نیا شوق ہوا ہے ایک سگریٹ میں چار چار دوست کش لگا رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان تصویروں کو ٹھہرا دوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مگر زندگی میں کس چیز پہ اپنا بس چلا جو اب اختیار ہو۔ وہ ملے بھی تو اسی طرح چشم زدن میں گزر گئے تھے۔ آہا کتنی پیاری تصویر ہے۔ جاوید بھائی میرے ماموں زاد بھائی مجھے زندگی میں پہلی بار کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دکھلانے لیجا رہے ہیں۔ آسٹریلیا اور ہندوستان

کے درمیان ۔۔۔ اچھی طرح یاد ہے یہ میچ کا دوسرا دن ہے
ایک سیزن ٹکٹ میں ہمارے کنبے کے مختلف افراد نے یہ میچ دیکھا
کہ ٹکٹ وہی لائے تھے۔ صفدر نعمانی میرے پھوپی زاد بھائی تھے
مجھ سے عمر میں تقریباً دس سال بڑے برسوں ہمارے گھر
میں رہے۔ ابا نے ہی انہیں پالا تھا۔ نام تو ان کا صفدر تھا مگر
بیکری خریدنے کے بعد وہ صفدر نعمانی ہو گئے۔ پتہ نہیں
کیسے۔ انکو ابھی تعلیم مکمل کرتے تک ہمارے ہی گھر رہے۔ ان
کے تمام اخراجات ابا نے ہی برداشت کئے۔ اس کے بعد وہ
کسی بیکری میں ملازم ہو گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مینجر بنے۔
بیکری کے مالک کی لڑکی سے شادی کی اور پھر ترقی کرتے
چلے گئے۔ بیوی دائم المرض تھی۔ وہ بچپن سے ہی پڑا رہتا تھا
مگر صفدر نعمانی کو بس ترقی کی دھن تھی۔ اور وہ انہوں نے اپنے
حساب سے کی یہ فالتو باتیں میں کیوں یاد کر رہا ہوں۔ ہاں یہ کرکٹ
میچ کی تصویریں رہیں۔ بریبورن اسٹیڈیم جانے کے لئے۔ ہم
بھی شامل ہو گئے ہیں اندر پہنچ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں۔ اتنا بڑا
میدان اور تل دھرنے کی جگہ نہیں میدان کتنا خوبصورت ہے ۔!
بیضوی شکل میں یکساں کٹی ہوئی گھاس سبز فرش کی طرح پورے
میدان میں بچھی ہے۔ جاوید بھائی دوربین سے پویلین میں دیکھ رہے
ہیں دیکھو وہ رہی لتا منگیشکر نے بمبئی میں کوئی باہر کی ٹیم آئے دلیپ کمار
دلیپ کمار کو دیکھے ۔۔ ؟ یہ لو نظر آئے اماں وہاں دیکھو۔۔ وہ
گھڑی نظر آ رہی ہے ؟ بس اس کے داہنے طرف آئے نظر۔ نہیں دکھائی

دیا۔ ہاں ذرا چہرہ اور دائیں کو گھمائیے۔ دیکھا۔ اور کون کون ہے پتہ چلا۔ نہیں جانتے۔ وہ دیکھو نلنی جیونت پاس کھڑی ہوئی کس سے گفتگو کر رہی ہے پہچانا؟ نہیں پہچانا۔ اماں پر ان کو نہیں پہچانتے۔ پہچانا۔ اچانک تالیوں کے شور سے میدان گونج اٹھا ہے۔ بھارت کی ٹیم فیلڈنگ کے لئے نکل پڑی ہے۔ ان کے پیچھے نیل ہاروی اور راونیل بیٹنگ کے لئے نکلے ہیں اور تالیوں کی آوازوں میں اور شدت آگئی ہے۔ نیل ہاروی جو اس وقت میرے لئے دنیا کا عظیم ترین بلے باز تھا۔ جاوید بھائی کتنے خوش ہیں۔ ان کے دو ہی شوق ہیں۔ فلم اور کرکٹ جب بھی وقت ملتا ہے یا کھیل میں دلچسپی کم ہونے لگتی ہے وہ دوربین سے اپنے پسندیدہ فلمی ستاروں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ سنا ہے وہ خود بھی فلموں سے منسلک ہونے کے لئے کوشاں ہیں۔ انہیں فلمی کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ کہانیاں لئے اسٹوڈیوز کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ نیل ہاروی کی سینچری مکمل ہو گئی ہے اور سارا اسٹیڈیم کھڑے ہو کر تالیاں بجاتا ہوا اُسے مبارک باد دے رہا ہے۔ ایسا ہی ایک موقعہ اور یاد آتا ہے جب حنیف محمد ایک سو ساٹھ رن بنا کر آؤٹ ہوا تھا اور ریڈیو لین لوٹ رہا تھا تو تمام تماشبین اُٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ بھی کیا کھلاڑی تھا۔ کریز پر کھڑا رہتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ قیامت تک آؤٹ ہی نہ ہوگا۔ تصویر پھر بدل گئی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے اور تماشبین اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے کچھ اُکتا بھی گئے ہیں۔ بھیڑ اس قدر ہے کہ ہلنے کا موقع نہیں۔ کھا پی کر لوگ اپنے طور

بہ ہی تفریح لے رہے ہیں۔ کیلے کے چھلکے کی جیسے بارش ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی گالم گفتار بھی شروع ہو گئی ہے۔ کچھ تماش بین برف کے ٹکڑے پھینک پھینک کر مار رہے ہیں۔ کسی کے سر پر زور سے برف کا ٹکڑا لگا ہے اور اُس کے ساتھی لڑتے کے لئے بھیڑ میں سے جگہ بناتے ہوئے اوپر جا رہے ہیں۔ اور لوگ سمجھا بجھا کر انہیں روک رہے ہیں۔ جن لوگوں نے برف پھینک کر مارا ہے وہ معذرت چاہ رہے ہیں۔ آخر معاملہ نپٹ گیا ہے۔ جس کے چوٹ لگی ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے دوستوں کو روک لیا ہے۔ اب مجمع باؤنڈری لائن پر فیلڈنگ کر رہے کھلاڑی کو کیلے کے چھلکے مار رہا ہے۔ نیل ہاروے نے ایک بار پھر چوکا لگایا ہے اور گیند جالیوں کے پاس سے ہوتی ہوئی پبلک کے پاس آگئی ہے باؤنڈری لائن کا فیلڈر جالی کے پاس آیا ہے اور مجمع میں سے کسی نے گیند کے بجائے نارنگی پھینک دی ہے۔ کھلاڑی بڑبڑا رہا ہے اور پبلک تفریح لے رہی ہے۔ ایک اور منظر۔ جاوید بھائی نے دوربین مجھے تھما دی ہے۔ بالیو ناڈ کرنی گیند ڈال رہا ہے۔ نیل ہاروے نے پیر آگے نکال کر گیند کو روکنے کی کوشش کی ہے مگر گیند پیر اور بلّے کے درمیان سے گزرتی ہوئی اسٹمپ سے جا لگی ہے۔ گھبرا کر میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹالی ہے۔ ہاروے سچ مچ آؤٹ ہو گیا ہے۔

"ہے سوں تھیو رے کیا ہو گیا" آگے بیٹھا ایک پارسی بوڑھا پوچھ رہا ہے۔

"ہاورڈی آوٹ ہوگیا" (ہاروڈی آوٹ ہوگیا) اُس کے پوتے نے اسے سمجھایا ہے۔ اور اب مجمع اُس سے تفریح لینے لگا ہے۔ مگر پارسی بڑا خوش مزاج ہے وہ خود بھی مزے لے رہا ہے۔ کھیل کی اُسے سمجھ نہیں۔ وہ تو اپنے پوتے کو میچ دکھانے کے لئے لایا ہے۔ اور یہ شام کا وقت ہے۔ میں اور جاوید بھائی تھکے ہارے بس اسٹاپ پہ گھر لوٹنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ دن بھر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔

ہاتھ، پیر، سینہ، دل سب ختم ہو چکے بس دماغ کام کر رہا ہے کیسے کام کر رہا ہے، مجھے پتہ نہیں، سمجھ میں نہیں آیا مجھے خوش ہونا چاہیئے یا دکھی یہ نعمت ہے یا عذاب؟ ذہن میں ہر وقت ریل سی چلتی رہتی ہے۔ ایک نا مختتم ریل۔ کبھی نظر آتا ہے کہ میں گھر میں بیٹھا ہوں۔ افرادِ خانہ دسترخوان پر جمع ہیں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ ریڈیو بج رہا ہے۔ کبھی تصور بندھتا ہے کہ میں میدان میں فٹ بال کھیل رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اسپانسرڈ sponsored پروگرام ہے جس میں میری زندگی کے خاص خاص واقعات پیش کئے جا رہے ہیں زندگی کی تمام اچھی بری باتیں بغیر کسی ترتیب کے ذہن کے اسکرین پہ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر چلتی ہیں پھر ہلکی ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تصویریں بڑی تیزی سے گزرتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے کبھی کبھی ٹی۔ وی سیٹ میں کسی خرابی کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ کبھی تصویریں ٹھہر ٹھہر کر گزرتی ہیں۔ جیسے ایک ایک پل کو سلو موشن میں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کوئی تصویر رک جاتی ہے۔

اندھیرے میں سرکتی رہتی ہے۔ میرا پتہ نہیں کب سے چل رہا ہے۔
ذہن کے اسکرین پر چلتی تصویروں سے کبھی کبھی یہ اندازہ ہوتا ہے
کہ میں مرچکا ہوں۔ مگر مجھے مرے ہوئے کتنا عرصہ ہوا۔ اس کا اندازہ
نہیں ہوتا۔ ممکن ہے میں محض ایک تصور ہوں، ایک خیال،
چونکہ میں سوچ رہا ہوں اور اس کا مجھے یقین ہے کہ اس تصور کے
ساتھ میں جڑا ہوا ہوں، اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے
میرا دماغ بچ گیا ہے۔ سائنس کا ایک FREAK واقعہ ہے کہ
سارا جسم تو کیڑوں نے کھا لیا مگر دماغ بچ گیا۔ مگر تو اسے بھی جانا
چاہیئے تھا کہ جب ہاتھ پیر نہ ہوں، آنکھیں نہ ہوں، جسم کے دوسرے
ضروری اعضا نہ ہوں تو بھلا دماغ کس کام کا۔ یا مصلحتِ قدرت
نے دماغ کو زندہ رکھا ہے۔ اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا
حساب دماغ کا خودکار کمپیوٹر میرے سامنے پیش کر رہا ہے۔
اب تک کوئی فرشتہ میرے پاس نہیں آیا۔ غالباً وہ خوش
قسمتوں کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ مجھ جیسے لوگ تو یونہی چھوڑ دیئے
جاتے ہیں۔ تو بیٹا پڑے رہو اور اپنی زندگی کے لمحے کا حساب خود
لیتے رہو۔ پر کون ہے جو اپنی زندگی کا حساب کرے اور احساسِ
زیاں سے دوچار نہ ہو۔ شاید میرے لئے یہی عذاب تجویز کیا گیا
ہے۔ ٹھیک ہے میں نے زندگی میں اور کیا بھی کیا ہے ؟ سوچنا،
سوچنا اور بس — سوچنا۔ ہو سکتا ہے اسی لئے ذہن اس قدر
حساس ہو گیا ہو کہ اُسے ذرّت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ خدایا یہ
کب تک چلتا رہے گا ؟ اب برداشت نہیں ہوتا۔ اگر ہزاروں

لاکھوں سال یہ دنیا اسی طرح چلتی رہی تو؟ اس تصور سے ہی
ذہن تھرا اٹھتا ہے ۔ اتھاہ وقت اور ذہن کی نا مختتم رو۔ ہاں
اب یاد آیا کبھی کبھی بالکل خالی لمحے بھی آتے ہیں۔ جیسے ٹیپ خالی ہو۔
اور اگرچہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا مگر ذہن کبھی بالکل آف بھی ہوا
ہے۔ ایسا کیوں سوچتا ہوں۔ بتا نہیں سکتا مگر ہوا ضرور ہے۔ خدایا
اب ذہن کو ہمیشہ کے لئے مٹا دے کہ اب برداشت نہیں ہوتا۔
اپنے وجود کے اس آخری احساس کو بھی چھین لے۔ مجھے عدم میں ڈبا
دے کہ اب میں خود کو بھول جانا چاہتا ہوں۔

خلا، مکمل خلا، گھپ اندھیرا! اس اندھیرے میں ایک تصویر
روشن ہوئی ہے۔ یہ کس کی تصویر ہے یہ تو امی ہیں۔ کسی کو
چائے بنا کر دے رہی ہیں۔ کون ہے یہ؟ تصویر بہت دھندلی
ہے۔ یہ تو اپنے صفدر ہیں۔ ہاں اب تصویر صاف ہو گئی۔
یہ صفدر ہی ہیں، صفدر رلغانی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ شہلا
ان سے کتنی چڑتی تھی۔ شہلا کیا سب ہی کا انہیں دیکھ کر موڈ
خراب ہو جاتا ہے۔ سیاہ کوّے جیسا چہرہ۔ صورت سے
ہی مکاری ٹپکتی تھی، نگاہیں ہر وقت یہاں وہاں بھٹکتی رہتیں
جیسے تلاش کر رہے ہوں کیا چیز اٹھائی جائے۔ ان سے گھر والوں
نے لاکھ بے اعتنائی برتی ان کے رویے میں فرق نہ آیا۔
پتہ نہیں کس مٹی کے بنے تھے۔ بڑے گھاگ شکاری تھے۔ بالآخر
ان کا صبر رنگ لایا اور امی کا رویہ ان کی طرف سے بدلنے لگا۔

ہم سب ان کے بدلتے رویے سے حیران تھے۔ آپا بھی سمجھتی تھیں۔ مگر امی کے سامنے کیا دم مارتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ امی نے یکایک یہ رویہ بدل کیوں دیا۔ یہ تو بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ اُن کے سامنے دراصل میرا مستقبل تھا۔ ہائے یہ ساری زیادتیاں میری ہی وجہ سے ہوتی تھیں۔ امی کو مجھ سے بے حد محبت تھی۔ اور یہ بات کسی سے چھپی نہ تھی۔ میری شکل دیکھ کر وہ جیتی تھیں۔ ابا کو انتقال کئے کئی سال ہو چکے تھے۔ انہوں نے کمپنیوں کے شیئرز، بینکوں کی بچت وغیرہ کے ذریعے اتنا پس انداز کیا تھا کہ گھر کا خرچ نکل جاتا تھا۔ دوسرے اخراجات کی ہی یقیناً امی کو دقت ہوتی ہوگی۔ مگر انہوں نے مجھے اس کا کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ اگر میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے ضد نہ کرتا تو وہ اسے پانچویں درجے کے بعد ہی گھر بٹھا دیتیں کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ بہنیں بھی سمجھتی تھیں مگر وہ خود مجھ پر جان چھڑکتی تھیں۔ کیل بھی چبھ جاتی تو ان کے چہرے فق ہو جاتے۔ مگر یہ کون سوچ سکتا تھا کہ میری محبت میں امی اس قدر آگے جا سکتی ہیں کہ شہلا کی زندگی تباہ کرنے میں بھی انہیں تامل نہ ہو۔ ان کا ارمان تھا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ میرے والد انجینئر تھے۔ امی مجھے بھی اسی مرتبے پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ پر مجھے کب اس کا ہوش تھا۔ یہ صفدر شہلا کو کیسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں؟ سب ہی جانتے ہیں کہ صفدر کس لئے آتے ہیں۔ مگر ہمیں تو ہنسی آتی ہے۔ صفدر تو مجھ سے بھی دس بارہ سال عمر میں بڑے ہیں۔ بھلا شہلا اور ان کا کیا جوڑ؟

کہاں شہلا دھان پان سبک اور نوخیز اور کہاں صفدر۔ کرسی پر بیٹھتے تو پورے کے پورے سما جاتے۔ جسم تھل تھل، پستہ قد۔ بیس قدم چلتے تو ہانپنے لگتے۔ شہلا پہلو بدل رہی ہے اب اٹھی کہ اب اٹھی، اوہو جاوید بھائی تشریف لائے ہیں۔ آداب عرض ہے جاوید بھائی! کیسے آنا ہوا۔ کیسے آنا ہوا کہ بچے، بھئی ہم خالہ بی کے گھر آئے ہیں۔ آپ کیوں بلبلا رہے ہیں۔ جاوید بھائی ہمارے شاعر ہیں۔ دوسروں کی زمینوں میں شعر کہتے ہیں۔ ترقی پسند شاعر ہیں۔ ایک بار میں نے پوچھ لیا کہ جاوید بھائی آپ ترقی پسند شاعر ہیں؟ بولے یار جب ہم نے شاعری شروع کی تو اس وقت جو بھی شاعر ہوتا تھا ترقی پسند ہی ہوتا تھا۔ ہم نے بھی سوچا ٹھیک ہے۔ ہر شہر میں ایک ہی انجمن ہوتی ہے اور ترقی پسند ہوتی ہے تو ہمیں کیا ضرورت خود کو تکلیف دینے کی۔ ویسے قسم لے لو کہ ہم نے آج تک تنقید کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ شعر کا وزن بھی یہ سمجھو کہ ماچس کی تیلی سے ناپ لیتے ہیں۔

"تو آپ کاڑی ناپ شاعر ہیں"۔ میں نے پوچھا۔

"بس یہی سمجھ لو" انہوں نے کہا۔

"مگر جاوید بھائی یہ ہونا کیا ہے؟" شہلا نے پوچھا۔

"یہ خاص امر ہے۔ ہر ایک کو بتایا نہیں جا سکتا"۔ جاوید بھائی نے کہا۔ "مگر سمجھ لو کہ آج تک کسی نے ہم سے یہ نہیں کہا کہ آپ کا فلاں مصرعہ غیر موزوں ہے۔ اور کہہ بھی نہیں سکتا یہ ہمارا دعویٰ ہے۔"

"جاوید بھائی آپ کی ترقی پسندی پر کسی نے کبھی شک نہیں کیا" میں نے پوچھا "مزدور یا طوائف پر تو آپ نے آج تک کچھ نہیں کہا۔ آپ کی تمام نظمیں رومانی ہوتی ہیں۔"

"تو میاں پھر یہ ستار کیا لکھتا ہے؟" جاوید بھائی نے کہا "تم نہیں سمجھو گے ان باتوں کو۔ آپ ایکبار ترقی پسند یا انقلابی ہو جایئے، باقی کام ہمارے نقاد خود کر لیں گے۔"

"تو یہ ترقی پسند اور انقلابی ہونا ایک سی بات ہے" سہیل نے پوچھا۔

"تو اور کیا، جو انقلابی ہوگا وہ ترقی پسند تو ہوگا ہی" جاوید ذرا اینٹھتے ہوئے بولے۔

"جاوید بھائی! یہ تو آپ نقادوں کی سی باتیں کرنے لگے" میں نے چھیڑا۔

"میاں اور ادیبوں کی صحبت میں دو چار باتیں تو آدمی سیکھ ہی لیتا ہے" جاوید بھائی ہنسے۔

"ورنہ میاں ہم تو جو نیئر سردار جعفری کی وہ ہماری کہ کہ صف میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

— اور یار میری پوچھو تو بہ سچ بات یہ ہے کہ شاعری ہوتی ہے باقی سب چوتیا پنتھی ہے۔" اور یہ سالے جو نئے شاعر آئے ہیں، ان کے پاس کیا ہے؟ میں ٹوٹ رہا ہوں۔ بکھر رہا ہوں، ذات کے اندھے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے کا تماشہ دکھا رہے ہیں۔ تماشہ ہی کرنا ہے تو سرکس میں کیوں نہیں

چلے جاتے۔"

"جاوید بھائی آپ جیسے شاعروں ہی نے ترقی پسندوں کو بدنام کر رکھا ہے" میں نے کہا۔

"منّے میاں۔ یہ ادب کی باتیں ہیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔" جاوید بھائی سینہ پھُلاتے ہوئے بولے۔" ادب میں دو طرح کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو تخلیقی سرگرمی ہوتی ہے یعنی شعر کہنا افسانے لکھنا، ناول لکھنا، دوسری سرگرمی ہوتی ہے، انجمنیں بنانا، بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات استوار کرنا، سرکاری حلقوں میں رسوخ قائم کرنا۔ یہ جو دوسری سرگرمی ہے نا اس میں دوسرے درجے کے ادیب تمہیں پیش پیش نظر آئیں گے۔

۔ یہ بڑے بڑے نام ہیں نا، ان میں سے دیکھنا ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔ باقی رہیں گے۔۔۔"

"جاوید بھائی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! ہمیں یہ غلط فہمی نہیں" جاوید بھائی اور بھی سنجیدہ ہو گئے۔ ہمارا ٹیلنٹ تو بس کام چلاؤ ہے۔ لیکن ہم جینوئن شاعر ہیں۔ شاعری کو شاعری سمجھ کر کرتے ہیں۔ دھندہ نہیں بناتے۔"

صفدر نعمانی پُرانی وضع کی شیشم کی کرسی میں اپنا پورا بھاری بھرکم جسم دھنسائے ہماری گفتگو سن رہے ہیں۔ جاوید بھائی کو وہ یوں تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں کہ یہ سب لونڈیارپن ہے۔ ان باتوں میں کچھ نہیں دھرا دو دو بکریاں ہیں ان کی اور چاہتے ہیں کہ ایک اور شادی کرلیں

تاکہ بیویاں (بڑی) دو ہو جائیں۔" خالہ بی ہم نے بڑی اسٹرگل STARGEL کی ہے۔" یہ ان کا خاص جملہ ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے انہوں نے لفظ اسٹرگل سن لیا ہے۔ یہ لفظ ان کی گفتگو کی کلید ہے۔ آبا بتاتے تھے کہ ایک زمانے میں انہوں نے آٹے کا اتنا بلیک کیا تھا بلیک کنگ کے نام سے معروف ہوئے۔ عیش بھی خوب کیا تھا۔ شہر کی کوئی خوبصورت طوائف ایسی نہ تھی جو کسی نہ کسی وقت میں ان کے پاس نہ رہی ہو۔ ایک ہی لڑکی تھی اُسے اپنے قصبے کے ایک زمیندار گھرانے میں بیاہ کر وہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اور اس کے بعد سے ہی ان کی ہمارے گھر آمد و رفت بڑھ گئی۔ امّی کو پہلے تو آپا کا خیال آیا۔ مگر وہ تو اپنے شوہر کی ناگہانی موت کے بعد سے بالکل ہی بدل گئیں ہیں۔ اکثر سفید سوتی جوڑے پہنتی ہیں۔ صبح سے جو جانماز سنبھالتی ہیں تو چاشت کے وقت ہی اٹھتی ہیں۔ سر میں جگہ جگہ سفید تار نظر آنے لگے ہیں۔ امّی کی تیز نگاہوں سے بھلا صفدر صاحب کی آمد کی غایت کہاں چھپ سکتی تھی۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ تصویریں اپنی تنتوریں گزرتی چلی جائیں اور میں اتنی ہی بے تعلقی سے انہیں دیکھتا رہوں۔ جیسے سینما ہال میں ہوتا ہے۔ ائرکنڈیشنڈ سینما ہال میں آرام دہ کرسی پہ انتہائی اذیت ناک مناظر دیکھتے ہوئے بھی جب آنکھیں پونچھنے کے لئے رومال نکالے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ ہم محض تماش بین ہیں اور یہ تماشہ محض چند گھنٹوں کا

ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی کی یہ ریل بھی اگر یہی مشیئت میں
ہے کہ میں اسے بار بار دیکھتا رہوں تو اسی طرح دیکھوں۔ مگر ایسا
نہیں ہوتا۔ نہ مجھے اس کی اجازت ہے کہ اُسے جب چاہوں تب
بند کر سکوں۔ یہ تصویریں تو ذہن سے ایسی گزرتی ہیں، جیسے تیز برقی
کرنٹ دماغ کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ پتہ نہیں کس اذیت پسند خدا نے
ہمیں تخلیق کیا ہے کہ ہر لمحے ہم اپنے عمل کا انتخاب خود کرتے ہیں اور
پھر برسوں پچھتاتے رہتے ہیں کہ ہم نے ایسا ہی کیوں کیا۔ کچھ اور
بھی تو ممکن تھا۔ آخر ہمارا انتخاب یہی کیوں رہا۔ شاید ہم خود سادیت
پسند ہیں کہ اپنے کرب سے بھی لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ جان بوجھ
کر غلط انتخاب کرتے ہیں کہ بعد میں جی بھر کر پچھتا سکیں۔ کتنی ہی بار
خیال آتا ہے کہ شاید یہ لمحہ تھا یا شاید وہ لمحہ تھا کہ اُس وقت
اگر میں نے شہلا کو سہارا دیا ہوتا تو وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔
اپنی بے عملی کو میں نے پتہ نہیں کتنی بار کوسا ہوگا۔ مگر اب جب
وہ لمحات ـــ سینکڑوں بار یا ہزاروں بار میرے ذہن کے
اسکرین پر سے گزرے ہیں تو اب پتہ چلا ہے کہ جس طرح بیج
میں درخت پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح شعور کو سب پتہ
ہوتا ہے۔ چاہے جتنی بار بھی یہ داستان دوہرائی جائے، وہی
ہوگا کہ جو ہوا کہ اس قطرے کی تو وہی کہانی ہے۔ مگر پھر یہ عذاب
کیوں۔ ہ مجھے اس عذاب سے کیوں گزارا جا رہا ہے۔ کیا پتہ
قدرت کا بھی منشا یہ نہ رہا ہو۔ میں واقعی سائنس کا ایک
FREAK حادثہ ہوں کہ سوچتے سوچتے میرا دماغ اس قدر

حساس ہو گیا - کہ مجھے موت ہی نصیب نہیں ہوئی - مگر میں تو خود کو
گم کر دینا چاہتا ہوں - عدم تو کہاں ہے - مجھے اپنی آغوش میں
کیوں نہیں لے لیتا -
اندھیرا، گھپ اندھیرا - خلا، بے کراں خلاء - - میں - - - میں؟

پانچ

امّی اور آپا کھڑی ہیں دروازے پر - میں ایس ایس سی کا امتحان
دینے جا رہا ہوں - ہاتھوں کی محراب بنائے وہ قرآن لئے کھڑی ہیں
کہ میں اُس کے سائے میں گزروں - امّی زیرِ لب پتہ نہیں کیا پڑھ
رہی ہیں - امتحان کے لئے میں نے بھی کم محنت نہیں کی ہے - اپنی
امّی کی دعاؤں اور بہنوں کی محبت کے طفیل مجھے بھی یقین ہے
کہ پرچے ضرور اچھے ہوں گے - پرچے واقعی اچھے ہوئے اور
میں نے اچھے نمبروں سے پاس ہو کر کالج میں داخلہ لے لیا -
پاس ہونے کی خوشی میں صفدر صاحب نے مجھے نیا سوٹ سِلوا دیا
ہے - نئے جوتے لے کر دیئے ہیں - امّی نے پوری بلڈنگ میں اور
رشتہ داروں میں دہی بڑے تقسیم کئے ہیں - اگلے روز صفدر
صاحب بھی ملازم کے سر پر دس کلو ملائی کے کھاجے لدلئے
پہنچ گئے ہیں - ہم لوگ ہنس رہے ہیں کہ اتنی مٹھائی کون کھلائے

گا مگر صفدر لغمانی بھلا اپنی شان سے فروتر کوئی بات کیسے کر سکتے ہیں، اس وقت کس نے سوچا تھا کہ یہ سب زبان بندی کے سامان ہیں۔ نہ میں نے نہ شہلا نے، شاید امی نے بھی نہ سوچا ہو۔ ہم اپنی خوشیوں میں اس قدر گم تھے کہ یہ سب باتیں کون سوچتا؟ میرے ذہن میں کتنے ہی منصوبے تھے۔ ابھی تو مجھے دنیا فتح کرنی تھی۔ کالج میں میرے ٹھاٹ دیکھنے کے لائق تھے۔ کچھ تو امی کی کاٹ کسر، زیادہ تر صفدر صاحب کی مہربانیاں۔ جاوید بھائی کے کوٹ اور سویٹر تو مجھے آتے ہی تھے۔ میرے دوست مجھے رشک سے دیکھتے حالانکہ کالج کے ساتھی بھی سب خوشحال گھرانوں کے لڑکے تھے۔

اسکول کی پابندیوں کے برعکس کالج کی آزاد زندگی کتنی خوبصورت تھی۔ اسکول میں پرنسپل کا خوف، استادوں کا خوف، جغرافیے کے استاد آرہے ہیں سگریٹ پشت پر چھپا لیا۔ تاریخ کے استاد آرہے ہیں گلی میں مڑ گئے۔ کالج میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ ادھر کیلو تختہ سیاہ کی طرف کچھ لکھنے کے لئے مڑتا ہے اور کاغذی تیروں کی بارش ہو گئی۔ ایسا ہی ایک میرے بالوں میں آکر گھسا تھا اور جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو ریحانہ مجھے دیکھ کر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی تھی۔ میں نے مڑ کر آداب کیا تھا اور شرم سے اُس نے منہ چھپا لیا تھا۔ سانولی رنگ کی قبول صورت لڑکی۔ چہرے پر بس سیاہ لمبی آنکھیں سُرخ لائٹ کی طرح دل میں اترتی محسوس ہوتی تھیں۔ پریڈ ختم ہونے کے بعد کلاس سے

نکلتے ہوئے پھر آنکھیں چار ہوئی تھیں اور ڈبپو نے کہا تھا کہ بے وقوف یہی موقعہ ہے چائے کے لئے کینٹین میں بلا لے۔ اور دوستوں نے بھی تائید کی تھی اور دو پیریڈ بعد واقعی میں نے جھجکتے ہوئے کپکپاتے ہونٹوں سے اُسے چائے کے لئے مدعو کر ہی لیا تھا۔ میرے پیارے دوست جیمس بونڈ کی طرح انجان بنے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچے دھاگے کی طرح وہ بھی بندھی چلی آئی تھی۔ میں نے مڑ کر دوستوں کو دیکھا تھا وہ ایک دوسرے کو تالی دے رہے تھے۔ یہ مارا پاپڑ والے کو۔ اس کے بعد کئی لڑکیوں سے رسم و راہ ہوئی۔ میری نفیس عادتیں اور رہن سہن، گفتگو کا شستہ پن اور رکھ رکھاؤ لڑکیوں کو متوجہ ضرور کرتا تھا۔ درجے کی کوئی لڑکی ایسی نہ ہوگی جس نے میری کاپیوں کی تعریف نہ کی ہو۔ جس لڑکی کو دوستی کرنی ہوتی اسی راہ سے آتی۔ وہ آپ کی سوشیالوجی کی نوٹ بک ... ذرا اکنامکس کی کاپی دیں گے۔ آپ کی ہلکا سا تبسم اور میرے دل میں خوشی کے فوارے پھوٹنے لگتے۔ کاپیوں کا تو صرف بہانہ تھا۔ میں دراصل نصابی کتابوں میں سے کچھ نہ کچھ نقل کر لیتا تھا۔ دوستیاں استوار کرنے میں کاپیوں سے بڑی مدد ملی۔ کاپیوں سے کینٹین اور کینٹین سے شہر کے ریستورانوں اور سینماؤں کا فاصلہ طے ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ میں اس زندگی میں کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ کلاس میں حاضری برائے نام ہی ہوتی۔ میری زندگی رفتہ رفتہ کالج کیمپس اور کینٹین تک محدود ہو گئی۔ دوستی تو کئی لڑکیوں سے ہوئی مگر ریحانہ سے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ دن دن بھر ہم گھومتے پھرتے رہتے۔ نیشنل پارک، وہار ایک

پلوائی، کملا نہرو پارک، چوپاٹی، اپالو بندر غرض کوئی تفریحی مقام ایسا نہ تھا جہاں ہم ساتھ ساتھ نہ گئے ہوں، پتہ بھی نہ چلا کہ کب امتحان سر پر آکھڑے ہوئے۔ ناچار کتابیں لے کر بیٹھا۔ پر کتابوں میں کس کا دھیان لگتا۔ حروف آنکھوں کے سامنے سے اڑ جاتے اور ریحانہ کی شکل نگاہوں میں ابھرنے لگتی۔ ذہن شہر بھر کی سیر کرتا پھرتا۔ ریحانہ تو بہت تیز طالب علم تھی۔ اس کا ذہن کمپیوٹر سے کم نہ تھا۔ وہ تو آسانی سے پاس ہو گئی۔ میری امتحان دینے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ بیماری کا بہانہ بنا کر میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد دو سال تک کالج جاتا رہا مگر میرا سارا وقت کینٹین اور کالج کے احاطے میں گزرا۔ میرے احباب آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کے نئے نئے دوست بنے۔ ریحانہ کو مجھ سے زیادہ بہتر ساتھی ملے۔ اُس کی مجھ میں دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ مجھے بھی دوستوں کی کیا کمی تھی۔ میں خود اپنی ترنگ میں تھا۔ گھر والوں کو البتہ کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں باقاعدگی سے کالج جا رہا ہوں۔ اسی سرخوشی کے عالم میں تین سال گزر گئے۔

میرے نئے دوست فلموں میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا اُٹھنا بیٹھنا کالج کینٹین کے بجائے فلم اسٹوڈیوز کے آس پاس ریستوران میں ہونے لگا۔ پہلے تو میں نے فلموں میں کام حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی پھر پتہ نہیں کیوں میرے دماغ میں آیا کہ میں فلمی کہانیاں اچھی لکھ سکتا ہوں۔ ذہن کے اسکرین سے یہ تصویریں گزرتی ہیں اور خیال آتا ہے کہ میں نے بھی اپنی زندگی کس پاگل پن میں گنوا دی پھر پتہ نہیں کیوں آج بھی وہ دن اچھے لگتے ہیں

وہ جاوید بھائی کے ساتھ بیٹھ کر کہانیاں تیار کرتا۔ غیر ملکی فلموں اور ہندستانی فلموں کے ٹکڑے لے کر ایک نئی کہانی تیار کرتا۔ اُس کے اداکار طے کرتا۔ اُس فلم میں شمی کپور خوب چلے گا۔ یہ کہانی راجندر کمار کے لئے ٹھیک رہے گی۔ اور اس کہانی سے تو صرف دلیپ کمار انصاف کر سکتا ہے۔ اسٹوڈیوز کے اطراف کے ہوٹلوں میں فلمی ماہرین ہمہ وقت جمع رہتے ہیں جو سستے سے سستی اور مہنگے سے مہنگی فلموں کے بجٹ چائے کی میز پر منٹوں میں بنا دیتے ہیں۔ جاوید بھائی اور میں نے کتنی ہی فلموں کے اس طرح بجٹ بنائے ہوں گے۔ دراصل یہ سب تضیع اوقات کے بہترین ذرائع تھے۔ جسے لوگ اسٹرگل کا نام دیتے فلمی دنیا میں ہر دوسرا آدمی اسٹرگل کرتا نظر آتا ہے۔ کئی پروڈیوسروں کو ہم نے کہانیاں سنائیں، دو ایک نے ایک آدھ کہانی پسند بھی کی۔ ایک پروڈیوسر نے وعدہ کیا کہ جو فلم میں بنا رہا ہوں وہ مکمل ہو جائے پھر اگلی فلم تمہاری کہانی پر ہی بناؤں گا۔ کئی پروڈیوسروں سے بہت اچھے تعلقات ہو گئے۔ جاوید بھائی بھی میری ہمت افزائی کرتے۔

"بہت اچھے جا رہے ہو" وہ کہتے آج نہیں تو کل تو ضرور کامیاب ہو گے۔ اس لائن میں کامیابی دیر سے ملتی ہے۔ مگر جب بھی ملی سمجھو اگلا پچھلا سب وصول ہو گیا۔ بس موقع ملنے کی دیر ہے۔ اسٹرگل کی طرح چانس بھی اس لائن کا کلیدی لفظ ہے۔ بس چانس مل جائے۔ یہ کر رہا ہوں، وہ کر رہا ہوں۔ ایک چانس مل جائے جسے چانس مل گیا۔ وہ گویا سانپ اور سیڑھی کے اس کھیل میں اوپر چلا گیا۔ جس کی فلم ناکام ہوئی وہ سانپ کے منہ سے ہو کر نیچے پھسلتا چلا آیا۔ اب اُسے ساری

اسٹرگل دوبارہ کرنی ہوگی۔

چھ

آج ذہن کا اسکرین بالکل واضح ہے۔ صاف تصویریں، اور ترتیب بھی کچھ کچھ معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ بار بار تصویروں کو دیکھتے دیکھتے ذہن کے کسی خودکار نظام نے اسے صحیح کر دیا ہے۔ یا کسی انجانی قوت نے Remote Control سے درست کر دیا ہے۔ ذہن کی چبھن بھی کم ہے۔ یہ موہن کمار ہمارے گھر میں بیٹھا ہے۔ کتنی واضح تصویر ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ اس سے کتنی دوستی ہو گئی تھی؟ اکثر وہ گھر پر آ جاتا۔ کہیں جانا ہوتا تو مجھے ساتھ لے جاتا۔ اُس کے آنے سے گھر کے لوگ بہت مرعوب ہو گئے تھے۔ موہن کمار کی گزشتہ دس سال میں دو ہی فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ باقی دو فلمیں اناؤنس ہونے کے بعد تیزی سے تین چار ریل بن کر ڈبے میں بند ہو گئی تھیں۔ ان دنوں اس نے ایک نئی فلم اناؤنس کی تھی۔ اور نئے چہروں کی تلاش کا اشتہار دیا ہوا تھا۔ موہن کمار دراصل فلموں کے لئے ایکسٹرا لڑکے لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ شادی بھی اُس نے ایک ایکسٹرا لڑکی سے کی تھی جو فلموں میں ہیروئن بننے کے لئے آئی تھی۔ میرے لئے اُن دنوں وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ اُس کا گھر پر آنا شاید امّی کو ناگوار گزرا تھا۔ مگر میری محبّت میں امّی خاموش رہی تھیں۔ کالج کی تعلیم کا تو ان کا خواب

چکنا چور ہو ہی گیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے بیٹے جی مجھے اچھی خوش حال حالت میں دیکھ لیں۔ شاید سوچتی تھیں ممکن ہے میں اس لائن میں کامیاب ہو جاؤں۔ میرے جوش و خروش کو دیکھ کر بھی ان سے کچھ کہا نہ جاتا تھا۔

یہ تصویر تو شاید میں کبھی نہ بھول سکوں۔ شام کا وقت ہے۔ موہن کمار گھر پہ بیٹھا ہے فرماں بردار ماتحت کی طرح میں خوش خوش نیار ہو رہا ہوں۔ آپا چائے بنا رہی ہیں۔ امی سروتے سے چھالیا کتر رہی ہیں۔ وہ موہن کمار کے لئے پان بنا رہی ہیں۔ اسی وقت شہلا کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ وہ نارنجی کریپ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے ہے۔ نارنجی رنگ کی چھوٹ اُس کے عارض پر پڑ رہی ہے۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا ہے۔ شفق رنگ آسمان کی کرنیں کھڑکی کی راہ کمرے میں آ رہی ہیں، شہلا کا نکلتا ہوا قد، چھریرا جسم، غرض کہ ہر چیز مل جل کر کچھ ایسا تاثر پیدا کر رہی ہے کہ ہم سب ٹھٹک کر اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اُس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ کوئی کوئی لمحہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شہلا کو ہم پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ یا پہلی بار ایک شخصیت کے روپ میں وہ ہمارے سامنے آئی ہے۔

موہن کمار کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی ہے۔ اور جسم کو تھوڑا خم دیتے ہوئے بہت ہی دھیمے لہجے میں آداب کیا ہے۔

موہن کمار نے بھی بیٹھے بیٹھے ذرا سا جھک کر ہاتھ کے اشارے سے آداب کا جواب دیا ہے۔

"آپ کی اسٹڈی معلوم ہوتا ہے زوروں پر ہے۔ ہم کئی بار آئے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"جی ہاں، امتحانات نزدیک ہیں نا۔" شہلا بدستور دھیمے لہجے میں بول رہی ہے۔ اُس زمانے میں فلم انڈسٹری کے لوگ ہمارے نزدیک آسمان سے کم نہ تھے۔

"بورڈ کا امتحان دے رہی ہیں آپ" موہن کمار پوچھ رہے ہیں۔

"جی ہاں" ہلکی کپکپاتی آواز۔

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے، کالج میں داخلہ لو گی۔"

"جی نہیں، امّی کا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے" آواز شہلا کے حلق میں پھنس رہی ہے۔ آپا چائے لے کر آ رہی ہیں۔ انہوں نے ٹرے شہلا کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ شہلا نے ٹرے موہن کمار کی طرف بڑھائی ہے۔

موہن کمار نے ایک پیالی اس میں سے لے کر تپائی پر رکھ دی ہے اور دوسری پیالی میری طرف بڑھا دی ہے۔

"آپا میں بھی چائے پیوں گی،" شہلا نے آپا کے کان میں سرگوشی کی ہے "ابھی امّی لائیں۔" آپا جواب دے رہی ہیں۔ "بنی رکھی ہے۔"

"یہ آپ کیا غضب کر رہی ہیں۔" یہ موہن کمار کہہ رہا ہے۔ "آج کل تو ہر لڑکی کالج جانے کی خواہش مند ہوتی ہے۔"

"ہمارے خاندان میں اتنا ہی بہت ہے" امّی روکھے لہجے میں کہہ رہی ہیں "میں تو پہلے ہی بٹھا لیتی مگر منّے کی ضد تھی۔ اس لئے میں نے کہا جانے دو۔"

"جو آپ کی مرضی،" موہن کمار نے کہا "اپنے بچوں کا بُرا بھلا آپ بہتر سمجھتی ہیں۔"

میں کیا جانتا نہیں تھا کہ امّی شہلا کو کالج کیوں نہیں بھیجنا چاہتیں۔ دراصل میرے علاوہ ان کو کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہمارا گھر ویسے ہی ٹشتم

پُشتم چل رہا تھا۔ ایسے میں شہلا کے تعلیمی اخراجات کون پورے کرتا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے کسی بھی قسم کی تکلیف ہو۔ جتنی دیر میں گھر پہ رہتا، ان کی نگاہیں میرا طواف کرتی رہتی تھیں۔

"تب تو آپ امتحانات کے بعد فری ہو جائیں گی۔" موہن کمار نے کہا۔

"جی"

"یار شہلا چاہے تو ہماری مشکل حل کر سکتی ہے۔" موہن کمار نے مجھ سے کہا۔

"وہ کیسے" میرے منہ سے نکلا، اگرچہ اُسی لمحے میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"بھئی نئے چہرے کی، اور کیا؟"

امی نے موہن کمار کو حیرت سے دیکھا اور شہلا کا تو منہ ہی کھُلا رہ گیا۔

"معاف کرنا" موہن کمار نے فوراً امی سے معذرت کی "میں بے خیالی میں کچھ کہہ گیا۔ شاید آپ پسند نہ کریں۔ دراصل ابھی ابھی خیال آیا کہ شہلا تو فارغ ہو ہی جائیں گی۔ ادھر ہمیں بھی کوئی مناسب چہرہ نہیں مل رہا ہے۔ میں نے سوچا شہلا کا اسکرین ٹیسٹ لے کر دیکھتے ہیں۔ میرا تجربہ تو کہتا ہے کہ یہ بالکل موزوں رہیں گی، مگر بہر حال آپ کی مرضی مقدم ہے۔ آپ کی مرضی کے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے۔"

موہن کمار جب "ہم" یا "ہمیں" کہتا تھا تو مجھے بہت خوشی ہوتی.

تھی۔ گویا میں بھی اس کا شریکِ کار تھا۔ اگرچہ اس کی ریپوٹیشن اچھی نہیں تھی۔ مجھے اس بات کا احساس بھی ہو چلا تھا، کہ بات کچھ مناسب نہیں ہو رہی۔ امّی کو تو یہ بات ناگوار گزرنی ہی تھی۔ جیسا کہ ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ سارے خاندان میں تھڑی تھڑی ہو گی۔ مگر وہ میرے ردِّ عمل کی منتظر تھیں۔ اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب ہی گومگو کی حالت میں تھے۔ شہلا کی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ بھی جانتی تھی کہ سب کچھ مجھ پر ہی منحصر ہے۔

موہن کمار نے مجھے گومگو کی کیفیت سے نکالا۔ "خیر یہ سب آپ لوگ اطمینان سے سوچئے۔" اُس نے کہا۔ "میں اور سعید چلتے ہیں۔ ہم لوگ ہوٹل نے فیر جا رہے ہیں!"

میری جان میں جان آئی۔ اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

سات

موہن کمار کی تجویز نے گھر میں تفرقہ ڈال دیا۔ امّی اور آپا اس تجویز کے سخت خلاف تھے۔ بھلا ہماری لڑکی فلموں میں کام کرے گی؟ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فلم سٹوڈیوز میں میں نے خود لڑکیوں کی درگت بنتے دیکھی تھی۔ اس لائن میں عورتوں کے متعلق کوئی ڈھنگ سے گفتگو ہی نہیں کرتا تھا۔ میں خود اپنی بہن کو اس حالت میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں بھی سختی سے شہلا کو منع نہیں کر پایا۔

"شہلا تم اس لائن کو سمجھتی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "عورتوں کا اس میں جانا ٹھیک نہیں۔"

مگر وہ تو ہوا میں اُڑ رہی تھی۔

"منے بھائی میں دیکھوں گی کہ کوئی غلط حرکت ہو رہی ہے تو خود ہٹ جاؤں گی۔"!

"دیکھو پچھتاؤ گی بعد میں پھر مجھے دوش دو گی۔"

"نہیں کوئی بچی تھوڑی ہی ہوں۔" وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولی۔

"امی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ انشاءاللہ کبھی بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"اے موئی دیوانی ہوئی ہے۔" امی جھلائیں "شکایت وکایت تو بعد میں ہو گی پہلے تو سارے خاندان میں ہی ہمارے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔ یہ صفدر، شنو خالہ اور پتہ نہیں کون کون میری جان کھا جائیں گے۔"

"اب وہ زمانہ نہیں امی!" شہلا نے کہا۔ "آپ دیکھنا۔ دل سے تو سب ہی چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بھی فلموں میں کام کریں، شہرت حاصل کریں، خوب دولت اکٹھا کریں۔"

موہن کمار جیسے لوگوں کے لئے تو وہ بچی ہی تھی۔ وہ دانہ پھینکنا جانتے تھے، کس طرح شکار خود گھرتا چلا جاتا ہے یہ ہنر انہیں معلوم تھا۔ مگر شہلا کو کیسے سمجھاؤں۔؟

جاوید بھائی کو معلوم ہوا تو وہ بھی دنگ رہ گئے۔ یہ تو ان کے خیال سے بہت آگے کی بات تھی۔

"یار، یہ ڈائرکٹر بڑا احرامی معلوم ہوتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ مگر شہلا کو وہ بھی قائل نہ کر پائے۔

صفدر لغانی صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بالکل ہتھے سے ہی اُکھڑ گئے۔

"کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ کچھ خاندان کی عزّت کا بھی خیال ہے کہ نہیں؟" انہوں نے امّی سے کہا۔

امّی کو جلال آ گیا۔ وہ غصّے میں تھر تھر کانپنے لگیں۔ بھلا صفدر کی یہ ہمّت ان کے بچوں کو کچھ کہے۔ موا ہماری کمائی پر پلا پوسا اب ہمارے سامنے بول رہا ہے۔ اس کو بھی دن لگے۔

"اب تم تو نہ بکو" امّی نے صفدر سے کہا۔ "ورنہ پھر میرا منہ کھلے گا تو۔"

صفدر بھی چپ ہو گئے۔

کہنے کو امّی نے کہہ تو دیا مگر پھر انہیں بھی چپ لگ گئی۔ مگر بات زبان سے نکل چکی تھی۔ ہمیں یقین نہیں آیا۔ امّی اس طرح حالات کے سامنے ڈھیر ہو جائیں گی۔ یہ تو ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔

"منے تم ساتھ جانا شہلا کے" انہوں نے مجھ سے کہا۔

امّی کو باہر کی دنیا کا بھلا کیا علم تھا۔ مگر میں ان سے کہتا بھی کیا؟ صفدر بھی بے چارے "دیدم دم نہ کشیدم" کے مصداق خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اُن کی اونچی پیشانی پر کئی رگیں اُبھر آئیں تھیں۔

آٹھ

شہلا پہلی بار اسٹوڈیو جارہی ہے۔ بڑی طرح نروس۔ اپنی دانست میں اُس نے خوب سارا میک اپ کیا۔ اپنی بہترین ساڑی پہنی۔

"ان باتوں سے کیا فائدہ ؟" میں نے کہا تھا۔ وہاں تو ایکسپرٹ میک اپ مین ہوتے ہیں۔ جو فلم کی ضرورت کے مطابق میک اپ کرتے ہیں۔ تم کیا سمجھ رہی ہو؟ وہ تمہارے جاتے ہی شوٹنگ شروع کردیں گے ؟ پہلے تو اسکرین ٹیسٹ لیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ طے کریں گے۔ کہ تمہارا چہرہ فلم کے پردے کے لئے موزوں ہے یا نہیں۔ اور فلم کے لئے جو کہانی انہوں نے منتخب کی ہے اس کے لئے تم مناسب رہوگی یا نہیں۔!

شہلا پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلی بار کسی فلم اسٹوڈیو میں قدم رکھ رہی تھی اور پورے اہتمام سے جانا چاہتی تھی۔

کاش ذہن کا اسکرین اسی طرح صحیح چلتا رہے۔ شاید پہلی بار میں تمام واقعات کو اس طرح دیکھ رہا ہوں۔ بے تعلقی اور قدرے فاصلے سے پہلے تو تمام تصویریں گڈمڈ ہوجاتی تھیں یا بے ترتیبی سے اسکرین پر سے گزر جاتی تھیں۔ کم از کم پتہ تو چلے گا کہ میں نے کہاں کہاں غلطیاں کیں۔ مگر اس کا فائدہ ہی کیا ہے ؟ ہاں فائدہ تو کچھ نہیں۔ مگر میں جاننا

چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں؟ یا مشیئت مجھے بتانے پر مصر ہے!

گھر سے باہر فٹ پاتھ پر میں اور شہلا کھڑے ہیں۔ کتنا عجیب لگ رہا تھا۔ مجھے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکثر ہی اسٹوڈیو میں لڑکیوں کو اپنے بھائیوں یا والدین کے ساتھ آتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اور مجھے کتنا بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی میک اپ روم میں ہے اور بھائی یا باپ گھنٹوں باہر خاموشی سے اکتائے اکتائے بیٹھے ہیں۔ کبھی لڑکی ڈائریکٹر کے کمرے میں گھنٹوں بند رہتی اور اس کے ساتھ آیا ہوا شخص صبر سے بیٹھا رہتا۔ اسٹوڈیو کے ملازم اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے، مسکراتے، زیر لب ایک دوسرے کو مخاطب کر کے غلیظ سے فقرے کستے اور وہ بے چارا چپ چاپ منہ بنچائے بیٹھا رہتا۔ دیر بعد لڑکی تھکی تھکی سی برآمد ہوتی اور وہ خاموشی سے آس پاس دیکھے بغیر اسٹوڈیو سے باہر چلے جاتے۔

آج ٹیکسی میں میں خود بخود اپنی بہن کے برابر بیٹھا ہوا ہوں۔ جی چاہ رہا ہے کہ اتر کر بھاگ جاؤں مگر امی کی تاکید کا خیال آتا ہے۔ منے تم شہلا کے ساتھ رہنا اسے چھوڑ کر جانا نہیں

گاڑی سے باہر نکلتے ہی کئی شناسا چہروں نے میرا استقبال کیا تھا۔ دو ایک ہاتھ سلام کے لئے اٹھے بھی مگر ٹیکسی سے ایک نوخیز نوجوان لڑکی باہر نکلتے دیکھ کر ان کی مسکراہٹ ہونٹوں پر ہی منجمد ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت کا احساس بھی تھا۔ اور دکھ بھی کہ ارے تم بھی! میں سر جھکائے اسٹوڈیو میں چلا آیا تھا۔ موہن کمار کا آفس اسٹوڈیو کے پہلے منزلے پر تھا۔ وہ ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ چائے بسکٹ کچھ

پھل میز پر سجے رکھے تھے۔ ان کا مخصوص کیمرہ مین ریڈی قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ریڈی مجھ سے تو واقف تھا ہی۔ موہن کمار نے شہلا کو اُس سے متعارف کروایا۔

"بھئی یہ ہیں ہمارے کیمرہ مین ریڈی۔ بڑا پرفیکشنسٹ نیچر ہے ان کا۔ جلدی مطمئن نہیں ہوتے۔"

"اور ریڈی یہ ہیں شہلا — شہلا کماری کر لیتے ہیں۔ کیسا رہے گا؟"
موہن کمار ہنسا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

"نمستے شہلا جی" ریڈی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ مگر آنکھیں بڑی تیزی سے پورے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شہلا تو بہت ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے بھی گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اسکرین ٹیسٹ کی میرے خیال میں تو کچھ ضرورت نہیں ہے۔"
موہن کمار نے کہا "مگر یہ ریڈی صاحب کا کہنا ہے کہ اسکرین ٹیسٹ لینا ہی بہتر ہوگا آپ کا کیا خیال ہے سعید صاحب؟"

وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اسکرین ٹیسٹ تو ہونا ہی چاہیے" میں نے کہا۔ شہلا اتنی نروس تھی کہ اُسے تھوڑا وقت دینا ہی مناسب تھا۔

"ٹھیک ہے تو پہلے اسکرین ٹیسٹ ہی لے لیتے ہیں۔"

"ٹیسٹ کل دوپہر سے پہلے نہیں ہوگا۔ ریڈی نے کہا "ام میک اپ مین کو بول کر رکھے گا وہ کل دو بجے آئے گا۔ جب تک ہم لائٹ فائٹ سب ایڈجسٹ کر کے رکھے گا۔ نہیں تو آپ میڈم پریشان ہو جائے گا

کبھی کبھی لائٹ ایڈجسٹ کرنے کے واسطے ایک ایک گھنٹہ لگ جاتا۔ تین بجے آپ کو سب ریڈی ملے گا۔ آدھا گھنٹہ پہلے آپ کا ہم لائٹ میک اپ کردے گا۔ ایک دم معمولی، باقی رزلٹ آپ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ام جس کا بھی فوٹو لیا وہ آج تلک اپن کو یاد کرتا ہے۔"

ہم سمجھے اب چھٹی ہوئی۔ مگر موہن کمار نے روک لیا۔

"کہیں جانا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تھوڑی دیر بیٹھو پھر چلے جانا۔" اس نے کہا اور کال بیل دبائی۔

ملازم اندر آیا۔

"چار چائے لاؤ"

ملازم خاموشی سے واپس چلا گیا۔

شہلا رفتہ رفتہ نارمل ہو رہی تھی۔ اس سے مجھے بھی کچھ تسلی ہوئی۔

"ہر پروڈیوسر کے کام کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔" موہن کمار کہہ رہا تھا۔

"کمل سنگھ اپنے ہیرو ہیروئین فائیو سٹار ہوٹل میں سائین کرتا ہے تاکہ خوشگوار ماحول میں، اچھے موڈ میں گفتگو ہو۔ وہ ریہرسل اپنی آفس میں کرواتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے آفس کے ساتھ ایک بڑا کمرہ وہیں لے رکھا ہے۔ میں تو ریہرسل اپنے گھر پہ ہی کرواتا ہوں۔ ایک تو ماحول بڑا انفارمل اور خوشگوار ہوتا ہے۔ دوسرے بھاگم بھاگ نہیں ہوتی کہ صاحب فلاں جگہ جانا ہے۔ وہاں پہنچنا ہے۔ اسٹوڈیو

ہیں لوگ انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم لوگ سعادت مندی سے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ مگر ریڈی بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ چائے پی کر وہ اٹھ گیا۔

"ام چلتا ہے۔ بے بی تم دو ڈھائی بجے تک آجانا"

نو

"ایسا کرتے ہیں" موہن کمار نے کہا "نیلم میں چلتے ہیں لنچ آج وہیں لیں گے گھر سے میرا کھانا بھی نہیں آیا۔"

میں تو خیر ان باتوں کا عادی تھا۔ مگر شہلا پہلو بدلنے لگی۔

"مجھے آپ معاف ہی رکھیں" اُس نے کہا۔

"ارے کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو تم" موہن کمار نے کہا۔ "شہلا اب تم بڑوں کی دنیا میں قدم رکھ رہی ہو۔"

شہلا بے چاری جھینپ گئی۔ اُس سے کچھ کہتے نہیں بنا ہے۔ یہ تصویریں میں دیکھ رہا ہوں اور کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اور میں احمقوں کی طرح خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

نیلم میں ہم ایرکنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھے۔ بیٹھتے ہی موہن کمار نے بیئر کا آرڈر دیا۔ بیرے نے بوتل کے ساتھ دو گلاس سامنے لاکر رکھ دیئے۔

"کیوں بھئی چلے گی نا؟" موہن کمار نے آنکھ مار کر مجھ سے کہا۔

موہن کمار کے ساتھ میں بیئر دھڑا کے سے پینے لگا تھا، مگر گھر والوں

کو اس کا علم نہ تھا۔

شہلا نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔

"موہن صاحب، مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں،" میں نے با دل نخواستہ کہا۔

"اچھا بھئی معاف کرتے ہیں،" موہن کمار نے کہا "شہلا تمہیں نہیں معلوم یہ بڑا پیکڑ ہے اس کا پیٹ کسی ٹینکر سے کم نہیں۔ چھ چھ بوتلیں تو یہ یونہی پی جاتا ہے۔"

"آپ بھی موہن صاحب کیسی باتیں کرتے رہیں گے" شہلا نے کہا۔ "مجھے پتا ہے۔ منے بھائی اسے چھوئیں گے بھی نہیں۔"

مجھے کچھ خفت ہوئی۔ ماں بہنوں کو مجھ پر کتنا اعتماد تھا۔

بیئر سے گلاس تر ہوا تو موہن کمار موج میں آگئے۔ تھوڑا سا سرور آیا تو چہکنے لگے۔ اور انہوں نے کئی بڑی ہیروئنوں کے واقعات سنائے کہ جب وہ پہلی بار کیمرے کے سامنے آئی تھیں تو ان کی کیا حالت ہوئی تھی۔ اور اب کیا عالم ہے۔

"سشیل کماری ہے نا، میری پہلی فلم کی ہیروئن وہی تھی۔ اسے سب سے پہلے میں نے ہی چانس دیا تھا۔ تو شہلا ہوا یہ کہ میں نے طے کیا کہ مہورت شاٹ سشیل کماری پر ہی لیا جائے۔ تو صاحب سب مہمان آچکے ہیں۔ ساری بتیاں آن ہو چکی ہیں، ون ٹو ــــ اور بس ایک آسان سا جملہ ہے جو اسے ادا کرنا ہے مگر اب جو دیکھتے ہیں تو وہ لہرا رہی ہے۔ وہ تو چکرا کر گر ہی جاتی مگر

ہمارے ہیرو نے اُسے سنبھال لیا۔

"آپ تو مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔" شہلا نے کہا۔

"ارے نہیں۔ میں تو بس بتا رہا تھا کہ ہیروئینوں میں بھی کیا تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ کہاں تو وہ حال تھا اور ابھی پچھلے دنوں کا رد ار اسٹوڈیو میں شیل کماری کی شوٹنگ ہو رہی تھی بس شاٹ یہ تھا کہ اُس کو نالہ پار کرنا تھا۔ شاٹ کو ذرا سا سیکسی بنانے کے لئے اُس سے کہا گیا کہ نالہ پار کرتے ہوئے ساڑی گھٹنوں سے تھوڑا اوپر اٹھا لے۔ اُس نے بڑے اطمینان سے ساڑی گھٹنوں سے بھی کافی اوپر تک اُٹھالی اور پوچھنے لگی کیوں اتنا چلے گا؟ تو یہ فلم انڈسٹری ہے۔ یہاں آدمی دیکھتے ہی دیکھتے ایسا بدلتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔"

"موہن جی! مجھے تو کوئی ایسا سین نہیں کرنا ہوگا۔" شہلا نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں" اُس نے بڑے بے تکلف انداز میں شہلا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری پہلی پکچر ہے۔ بھلا ایسا سین ہم تمہیں کیسے دے سکتے ہیں۔" یہ تصویر دیکھتے ہوئے پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ شہلا سے گفتگو کرتے ہوئے وہ آپ سے تم پر آگیا ہے۔ اس وقت تو مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

"یہ تو بڑا جذباتی رول ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ رول تو دراصل کسی مشّاق اداکارہ کو کرنا چاہیے تھا مگر میں نے

سوچا کہ پھر اس میں ہمارا کمال ہی کیا ہوا۔؟ ہماری ڈائرکشن کا اس میں کیا حصّہ ہوا؟ یہ دراصل تمہارا نہیں بلکہ میرا امتحان ہے۔ بہت بڑا رِسک لے رہا ہوں میں۔"

موہن کمار اسی طرح چہکتا رہا۔ کھانا منگوایا گیا۔ چائے والے کہ ہم نکلے تو چار بج رہے تھے۔ شہلا بہت خوش تھی۔ جیسے ہوا میں اُڑ رہی ہو۔

دس

اب دیکھتا ہوں تو عجیب لگتا ہے۔ اپنی خود غرضیاں، مطلب پرستیاں اس وقت سمجھ میں نہیں آتی تھیں، کتنی صاف نظر آتی ہیں، معلوم کیسے نہ ہو گا۔ مگر اغراض و تاویل نے پردے جو ڈال رکھے تھے میں سمجھتا تھا کہ جو بھی کر رہا ہوں، ٹھیک ہی کر رہا ہوں۔ اس پر اپنی خودداری کا دعویٰ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اگر اس وقت کسی نے مجھ سے کہا ہوتا کہ تم اپنے مستقبل کے لئے اپنی بہن کو غلاظت کے کنوئیں میں جھونک رہے ہو، تو میں اس کا گلا پکڑ لیتا — تعجب تو یہ ہے کہ اس وقت یہ بات نہ صفدر بھائی کی سمجھ میں آئی نہ جاوید بھائی کے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ روشن خیال ہو رہے ہیں۔ صفدر بھائی کا بس چلتا تو وہ شہلا کا گھر سے نکلنا ہی بند کر دیتے مگر امی کے سامنے وہ بول نہیں

پائے تھے۔ برسوں دستِ نگر جو رہے تھے۔ ورنہ تمام رشتہ داروں کے ذاتی معاملات میں وہ پوری طرح دخیل تھے کسی کی نسبت فسخ کرادی، کسی کو ڈانٹ دیا کسی کے لباس پر قدغن، کسی کے رہن سہن پر ہمیں دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ سارا غصہ جاوید بھائی پر نکلتا تھا۔ وہ بے چارے سر جھکائے سعادت مندی سے سنتے رہتے، جاوید بھائی برسوں سے بمبئی میں جوتیاں چٹخا رہے تھے۔ کبھی دھیلے کی کمائی کر کے نہ دے سکے۔ ان کے کنبے کے جوان کی امی، چھوٹی بہن اور خود ان پر مشتمل تھا، تمام اخراجات صفدر بھائی ہی برداشت کر رہے تھے۔

شہلا دیکھتے ہی دیکھتے کانی بدل گئی۔ ہر آنے والا دن اس کی دلکشی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کا جسم غذاؤں سے ہی نہیں بلکہ ہواؤں سے بھی توانائی کشید کر رہا تھا ساتھ ہی ساتھ اس کا ذہنی رویہ بھی بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ پہلے وہ صفدر بھائی کو دیکھتے ہی بھڑ جاتی تھی، مگر اب اس میں ایک شائستہ رکھ رکھاؤ آگیا تھا۔ یا شاید اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر خاندان میں کوئی شخص گڑبڑ کر سکتا ہے تو وہ صفدر ہی ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے وہ بڑے جتن کرنے لگی۔

"صفدر بھائی چائے پئیں گے۔"

"صفدر بھائی پیسٹری لیجئے۔"

"آج آپ کچھ کھا نہیں رہے۔"

جاوید بھائی اور میں اُسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ لڑکیاں بھی کتنی

تیزی سے بدلتی ہیں۔ صرف رنگ روپ ہی نہیں بدل رہا تھا۔ بلکہ اس سے کہیں تیزی سے شعور پختہ ہو رہا تھا۔ بڑی تیزی سے وہ بچپن سے نوجوانی کی سرحدوں میں چلی گئی تھی۔

صفدر بھائی اس خصوصی توجہ پر بہت خوش تھے۔ انہیں شاید ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا صبر رنگ لا رہا ہے۔ جس دن وہ بہت خوش ہوتے میری جیب میں سو کا نوٹ ڈال دیا جاتے۔ یہ ان کی خاص ادا تھی۔ جاوید بھائی کے ساتھ بھی ان کا رویہ بدل گیا۔ روایتی خشونت کی جگہ شفقت نے لے لی۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ بالکل بڑے بھائی کا سلوک کرنے لگے۔ حد یہ کہ انہوں نے کئی بار جاوید بھائی کی نظمیں بھی سنیں اور کھل کر داد دی۔ یہ اور بات ہے کہ جاوید بھائی کو اس داد سے کوئی خوشی حاصل نہ ہوئی ہو۔ یار یہ صفدر بھائی کیا جانیں شعر و شاعری وہ اپنے پاؤ البسکٹ بنائیں ہمیں کیوں پریشان کرتے ہیں۔

گیارہ

یہ فوزیہ ہے۔ کتنی دیر بعد اس کی تصویر نظر آئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس کی تصویریں میں بار بار دیکھنا چاہتا ہوں وہ کم ہی نظر آتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ اس کے درشن تو پہلے بھی کم ہی ہوتے تھے۔ اسی لئے تو وہ جہاں بھی نظر آتی تھی میں رُک جاتا تھا۔ یہ اس کے بچپن کی تصویر ہے۔ کیسی دیو سی لگتی ہے۔ سوکھی مرگھلی سی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بچی بڑی

ہو کر اتنی خوبصورت نکلے گی۔ پھر بھلا میں کیا اس کی طرف توجہ دیتا۔ وہ تو اگر
اس شام میری اس پر نظر نہ پڑتی تو شاید مجھے اُس کے ہونے کا کبھی احساس
ہی نہ ہوتا۔ اسکول کا امتحان پاس کرنے کے ایک، آدھ سال بعد ہی وہ
بینک میں ملازم ہوئی تھی۔ ان دنوں ایک بار میں نے اُسے بس اسٹاپ پر
کھڑا دیکھا تھا اور سامنے فٹ پاتھ پر اُسی کو دیکھتا کھڑا رہ گیا تھا۔ سُرمئی
قمیص، گلے میں لاکٹ، کندھوں پر ڈھلکتا دوپٹہ، آنکھوں پر دھوپ کا
چشمہ، چہرے پر سنجیدگی اور وقار۔ بس آتے ہی اُس نے چشمہ اُتار کر
بڑی بڑی آنکھوں سے نہرتا کا تھا اور تیزی سے بس کی طرف بڑھ گئی
تھی۔

فوزیہ ہفتے میں ایک بار سنیچر یا اتوار کو شہلا سے ملنے ضرور آتی
تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی تھی اور بڑی دوستی تھی
اُن میں۔ اکثر وہ سہ پہر کے وقت آتی تھی۔ یہ دو دن عموماً باہر گزرتے
تھے، کسی فلم اسٹوڈیو میں یا دوستوں میں۔ مگر ان دنوں میں جلد ہی
گھر لوٹ آتا۔ گیلری میں کرسی رکھ کر ایسے زاویے سے بیٹھتا کہ اس کا
چہرہ نظر آتا رہے۔ بظاہر یوں ہی کسی فلمی پرچے کی ورق گردانی کرتا رہتا،
ہماری نظریں اکثر چار ہوتیں۔ کبھی کبھار میں کسی بہانے اُس کے قریب جا
کر بیٹھ جاتا۔ گفتگو کی کوشش کرتا مگر وہ اس قدر
نروس ہو جاتی تھی کہ بات کرتے ہوئے اس کے سُرخ یاقوتی ہونٹ
لرزنے لگتے۔ کانوں کی لویں تمتما اٹھتیں۔ اس کا تپا ہوا چہرہ مجھے بہت بھلا
لگتا تھا۔ بداخلاقی نہ ہوتی تو شاید میں اُس کے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹاتا،
وہ گفتگو بھی بہت ٹھہر ٹھہر کر، بڑے دھیمے اور شستہ لہجے میں کرتی۔

تی۔ باتیں کرتے کرتے وہ اچانک سر کو ایک طرف جھٹک کر ہلکا سا قہقہہ لگاتی تو کانوں کے آویزے ہلنے لگتے اور دیر تک ہلتے رہتے۔ کبھی وہ جوڑا باندھتی تو اس کی لمبی گردن بڑی خوبصورت معلوم ہوتی جیسے کسی آرٹسٹ کے موقلم کا نتیجہ ہو۔ جی تو چاہتا تھا کہ اُس سے خوب باتیں کروں دوستی بڑھاؤں۔ پر پتہ نہیں کیا بات تھی اُس کے سامنے جا کر میں خود مرعوب ہو جاتا تھا۔ اکیلے میں، خصوصاً اس کے جانے کے بعد میں نے کئی بار تجزیہ کیا۔ خود کو سمجھانے کی کوشش بھی کی' بھلا اِس لڑکی میں ایسی کیا بات تھی۔ ایسی سینکڑوں لڑکیاں ہوں گی۔ اُس کے نقوش میں بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر خامیاں ڈھونڈیں مگر دل کی کیفیت ویسی کی ویسی رہی۔

میری مسلسل ریاضت البتہ رنگ لائی۔ اس کے چہرے سے بھی... پسندیدگی کا کچھ نہ کچھ اظہار ہونے لگا۔ وہ مجھے دیکھتی تو مسکرا دیتی۔ کبھی خیریت بھی پوچھ لیتی کہ کہئے منے بھائی کیسے ہیں آپ؟ ہمارا گھر اُسے پسند تھا اور میرے گھر کے لوگ ہمیشہ میری تعریف کرتے تھے۔ یقیناً اس کا بھی اس پر اثر ہوا ہو گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے مستقبل کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر میرے دماغ میں ہوا بھری ہوئی تھی یا گھر والوں نے بھر دی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ تمام مسائل میں چٹکی بجاتے حل کر سکتا ہوں۔ وہ تو میں ان پر توجہ نہیں دے رہا تھا ورنہ تو میرے لئے وہ بے حد معمولی مسائل تھے۔

بارہ

اگلے روز شہلا اور میں اسٹوڈیو پہنچے تو واقعی سب کچھ تیار تھا۔ موہن کمار نہیں تھا۔ پتہ چلا کوئی لڑکی ہے للیتا۔ بڑی تیز لڑکی ہے۔ موہن کمار کو پیچ پڑ گئی ہے۔ اس کا باپ بھی ساتھ میں ہے۔ بہرحال ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ریڈی نے مختلف زاویوں سے کئی تصویریں لیں۔ چائے پلائی اور ہمیں رخصت کر دیا۔ اُسے کئی اور کام تھے۔

ہم لوگ اسٹوڈیو سے نکل ہی رہے تھے، ایک سفید مرسڈیز کار دروازے سے داخل ہوئی۔ ہمارے برابر آکر گاڑی رُکی۔ گاڑی میں ڈائریکٹر درشن بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے شہلا کو بڑے غور سے دیکھا، پھر خاموشی سے آگے بڑھا دی۔

"منّے بھائی، کون تھا یہ آدمی"؟ شہلا نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ پہچانتے ہیں اِسے؟"

"ڈائرکٹر درشن تھا،" میں نے کہا۔

"اچھا وہ جس کی فلم ناولٹی میں چل رہی ہے"۔

"ہاں" میں نے کہا۔

"کم بخت ایسی بے باکی سے گھور رہا تھا۔ میری تو حالت ہی عجیب ہو رہی تھی" میں اُس سے کیا کہتا کہ یہاں تو لڑکیوں کو یونہی

دیکھا جاتا ہے جیسے منڈی میں قصائی جانوروں کو دیکھتے ہیں، شہلا کو اپنی سہیلی فیروزہ کے گھر جانا تھا اسے میں نے وہاں چھوڑا اور کافی ڈیلایٹ پہنچا۔ جہاں میں اور میرے دوست بیٹھتے تھے۔ روڈ پار کرتے ہوئے ایک موٹی سی لڑکی نے مجھے کھٹکا دیا۔ یہ ریحانہ تھی، بدن پھول گیا تھا۔ مگر گال دھنس گئے تھے۔ چہرہ بھی پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ جیسا اکثر شادی شدہ عورتوں کا خون کی کمی کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ ریحانہ سامنے کی فٹ پاتھ سے ایک بچے کی انگلی پکڑے گزر رہی تھی، ہو سکتا ہے، اس نے بھی مجھے دیکھا ہو۔ آواز دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ دل ہی نہیں چاہا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ وقت بھی انسان کو کیسے بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے جسم کی کشش سے کھنچے چلے جاتے تھے۔ اور ایک یہ وقت ہے کہ دونوں ہی جسم ایک دوسرے میں بالکل بھی کشش محسوس نہیں کر رہے۔

ہوٹل میں میرے دوست ونود اور روی بیٹھے جوک باکس پر فلمی گانے سن رہے تھے۔ ہماری کالج کے زمانے سے دوستی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے چائے کا آرڈر دیا۔

"کیا بات ہے یار۔ آج کل بالکل غائب ہو" ونود نے پوچھا۔

"یار کیا بتاؤں، بس [illegible] چل رہی ہے"

"تم تو آج کل موہن کمار کو چپکے ہوئے ہو نا"

"ہاں یار اسی کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔"

"اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو گیا؟"

"بس یہی سمجھو"

"کچھ پیسے دیسے بھی مل رہے ہیں یا نہیں؟"

"پیسے تو کچھ خاص نہیں مل رہے۔ مگر اس نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے کوئی سالڈ (ٹھوس) چانس دلوائے گا۔"

"بیری مانو تو ڈائرکشن سیکھ لو"

"یار میں خود سوچ رہا ہوں مگر اس کی کوئی فلم اس وقت سیٹ پر نہیں ہے۔"

"اور وہ اشتہار جو آیا تھا نئے چہروں کے لئے۔"

"ہاں اشتہار تو دیا ہے۔ اس کا ارادہ ہے ایک فلم شروع کرنے کا۔"

"تو بس پھر کیا ہے، تم لگے رہو۔" ونود نے کہا۔

"جب تمہارے تعلقات اتنے اچھے ہیں اس سے تو ڈسٹری بیوشن رائٹس کیوں نہیں لے لیتے۔" روی نے کہا۔

"ہاں یہ تو اور بڑھیا بات ہو گی۔"

ایسی ہی باتیں چلتی رہیں۔ کتنا خوبصورت عکس ہے۔ یہ ہوٹل سمندر کے کنارے دوسری سڑک پر تھا۔ حسب معمول سمندری ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بڑی تیزی سے ہوٹل کے شیشوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہے تھے۔ دروازے سے آتی ہوئی ہوائیں چہروں کو سہلاتی گزر رہی تھیں۔ یہ زندگی کتنی رنگین ہے۔ اس تصویر کو ٹھہرا لینے کو جی چاہتا ہے۔ شام کی ہل چل زوروں پر ہے، نوجوان دمکتے چہرے زندگی کے عیش کا ایک ایک قطرہ اپنے جام میں انڈیل لینا چاہتے

ہیں۔ حسین تصورات کی دنیائیں سجائی جا رہی ہیں۔ ہم تینوں بھی خیالوں کے محل بنا اور بگاڑ رہے ہیں۔ دنیا قدموں میں پڑی معلوم ہوتی ہے۔

"تم ایک بار جم جاؤ۔ پھر ہم لوگ بھی فلم لائن میں آتے ہیں" روی کہہ رہا ہے۔

"تم کیا کرو گے۔؟" میں نے پوچھا۔

"پکچر بنائیں گے اور کیا۔ جب ایسے ایسے ڈفر لوگ پکچر بنا لیتے ہیں تو کیا ہم لوگ نہیں بنا سکتے۔" دلو نے جواب دیا۔

"یہ لوگ جتنے ڈفر نظر آتے ہیں۔ اتنے ہوتے نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم لوگ کتنے خلوص اور بے غرضی سے ملتے ہیں۔ ان میں یہ بات نہیں ہوتی۔ باتوں کو تیزی سے گھما دینا، وعدہ کر کے مکر جانا، ابھی خوشامد کر رہے ہیں، ابھی غرانے لگے۔ کیسی ہی بے عزتی ہو پی لیا، پھر موقع ملتے ہی بدلہ بھی لے لیا۔"

"ان لوگوں سے ڈر بھی لگتا ہے۔ پیسوں کے لئے یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"یار اسی لئے تو کہہ رہے ہیں کہ ایک بار تم جم جاؤ" دلو نے کہا۔ "پھر دیکھنا۔ اکیلا آدمی فلم انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔"

"سنا ہے شہلا بھی کوشش کر رہی ہے۔" اچانک روی نے پوچھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا چہرہ سپید پڑ گیا۔

"وہ ہاں کر تو رہی ہے۔" آواز اندر کہیں بہت دور سے آ رہی ہے۔

"کچھ کام بنا۔"

دونوں مجھے بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"موہن کمار نے اپنی نئی فلم کے لئے اُسے منتخب کر لیا ہے۔"

"مگر وہ بڑی - STRIGHT FOR-WARD لڑکی ہے" مارواڑی نے کہا۔

"فلموں میں چلے گی نہیں۔"

میرے دوست شہلا کو مجھ سے بہتر جانتے تھے۔ ایک میں ہی بے وقوف تھا۔ یا میری آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

"موہن کمار نے خود ہی آفر کی ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"یار تمہارے لئے بڑی تیزی سے راستے صاف ہو رہے ہیں۔" ونود نے کہا۔

میں ان کا مطلب سمجھ رہا تھا مگر کیا کہہ سکتا تھا۔ بس ریستوران کے دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ دور آسمان پر شفق پھول رہی تھی۔ سورج کی ٹکیا افق پر پانی کی سطح کو چھو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں کے سامنے مکھن کی ٹکیا کی طرح پانی میں پگھلنے لگی۔

"یہ سالے مجھے اس طرح کیا دیکھتے ہیں۔" میں نے سوچا۔ "ان کا بس چلے تو یہ بہن کیا گھر بھر کو بیچ ڈالیں۔ سالے مارواڑی" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چلتے ہیں۔"

یہ تپش اس وقت بھی میرے ذہن کو جھلس رہی ہے۔ جب میں شاید ختم ہو چکا ہوں۔ پتہ نہیں قدرت مجھ سے کیا مذاق کر رہی ہے۔ سزا کا یہ انوکھا طریقہ آخر میرے لئے ہی کیوں؟ اگر مجھے سانپ اور بچھو کاٹیں تو شاید اتنا دُکھ نہ ہو۔ بس بس۔ میں اور سوچنا نہیں چاہتا۔ مجھے اندھیرا چاہیئے اور ان بے کار دماغی خلیوں کی تباہی۔

تیرہ

یہ ذہنی جہنم کدہ ختم کیوں نہیں ہوتا۔ یہ شاید کبھی ختم نہ ہوگا۔ دیکھو یہ پھر روشن ہو گیا ہے۔ یہ پھر ایک تصویر ذہن کی سطح پر اُبھر رہی ہے۔ ہم سب امّی کی پلنگڑی کے گرد جمع ہیں۔ خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ دروازے کی کال بیل بج رہی ہے۔ شہلا اٹھی ہے اور دروازہ کھولا ہے۔ ایک سانولا سا نوجوان کھڑا ہے۔ جرسی اور جینز کی پتلون پہنے، دھوپ کا چشمہ لگائے، انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا ہے۔ بڑے اسٹائل سے کھڑا ہے۔ جیسے کسی اشتہاری فلم کے لئے پوز دے رہا ہے۔ شہلا نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ہے اور میں جو امّی کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ہوں۔

"مجھے درشن صاحب نے بھیجا ہے" وہ بڑی ادا سے بول رہا ہے "ڈائرکٹر درشن نے"

"اوہ" شہلا نے اُسے اندر آنے کے لئے کہا تھا۔ "آپ اندر تو آئیے۔"

"تھینک یو" وہ اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"فرمائیے"، شہلا نے اُس سے پوچھا۔

"درشن صاحب نے پوچھا ہے کہ کل شام چار بجے کیا آپ دفتر پر آ سکیں گی۔ انہیں کسی فلم کے لئے بات کرنی ہے۔ یہ اُن کا کارڈ ہے۔ تاردیو پر ہمارا دفتر ہے۔ دوسرے منزلے پر۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"رکیئے تو" شہلا نے کہا۔ "میں ذرا سوچ لوں۔"

اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"مجھے تو یہ کچھ عجیب سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" شہلا نے کہا۔ "ابھی کل ہی اس بُری طرح گھور رہا تھا۔"

"ممکن ہے کوئی رُول اس کے ذہن میں ہو۔ تمہارے چہرے مہرے سے اس کا اندازہ لگا رہا کہ تم اُس کے لئے مناسب رہو گی یا نہیں۔"

"مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے اِس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

"آپ چلیں گے نا ساتھ۔"

"تمہیں خود اتنی ہمت پیدا کرنی چاہیے شہلا کہ اکیلے ہی ڈائرکٹروں پروڈیوسروں سے گفتگو کر سکو۔ میں تو اسٹوڈیوز جاتا ہی رہتا ہوں نا۔ یہ ہر وقت کا دُم چھلّا اِن لوگوں کو بالکل ناپسند ہوتا ہے موہن کماری کی بات اور ہے۔ اس سے میری دوستی ہے۔"

"مجھے تو ابھی سے خلجان ہونے لگا۔" شہلا نے کہا۔" میں اُس سے
نا کہہ دیتی ہوں۔"

"ارے یہ تو بھولے سے بھی مت کرنا، اِن باتوں کا تمہیں عادی
بننا ہی پڑے گا۔ آئے دن کسی نہ کسی پروڈیوسر، ڈائرکٹر یا اداکار
سے تو تمہیں ملاقات کرنی ہی پڑے گی۔ اور تمہیں تو لوگ کافی بولڈ
کہتے ہیں۔"

"نہیں بابا، مجھے تو ابھی سے کچھ ہو رہا ہے۔" اُس نے ہاتھوں
کو ملتے ہوئے کہا۔

"کرنا کیا ہے" میں نے کہا "جا کر اُس سے گفتگو ہی تو کرنی ہے۔"

"منّے بھائی آپ چلتے تو اچھا رہتا۔"

"تم پھر بچوں کی سی باتیں کرنے لگیں۔ دیکھو یہ بہت اچھا موقع ہے
درشن سال میں ایک پکچر تو بنا ہی لیتا ہے۔" اس کی کوئی فلم آج تک
رُکی نہیں۔ مکمل ہونے سے پہلے ہی بِک جاتی ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ مجھے تو وہ نگاہیں اب تک نہیں بھولی تھیں،
جن نگاہوں سے پہلی بار مجھے لوگوں نے اسٹوڈیو میں شہلا کے ساتھ
داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا تو اس کے تصوّر سے ہی کلیجہ اُلٹنے
لگتا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کہہ دوں کہ شہلا بس ختم کرو یہ چکر۔
مگر لفظ جیسے سینے میں پھڑپھڑا کر رہ جاتے تھے۔

"تو پھر ہاں کہہ دوں میں؟" شہلا نے مجھ سے کہا۔

"ہوں۔"

ہم دیوان خانے میں پہنچے تو درشن رائے کا اسسٹنٹ

شربت کے آخری گھونٹ لے رہا تھا۔ امّی اُس کے ساتھ گفتگو کر رہی تھیں۔

"تو درشن صاحب کا ہاتھ بٹاتے ہو تم" امّی اُس سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی" "ان کا اسسٹنٹ ہوں۔"

"ہاں وہ تو تم بتا ہی چکے ہو مگر تمہیں کرنا کیا ہوتا ہے؟"

"چھوٹے موٹے سب ہی کام کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی کسی اداکار کو مکالمے یاد کرا دیئے، کبھی ٹیلی فون پر بیٹھا رہتا ہوں۔ کسی کو اہم پیغام دینا ہو، اس کے گھر ٹیلی فون نہ ہو یا درشن صاحب چاہیں کہ میں خود پر جا کر بات کروں تو خود جانا پڑتا ہے۔ کبھی لیبارٹیری سے پرنٹ لانی پڑتی ہے۔ یا کچھ خریدنا ہو تو بھیج دیتے ہیں"۔ وہ بڑے اعتماد سے پیر پر پیر رکھ کر گفتگو کر رہا تھا اُس نے چشمہ تپائی پر رکھ دیا تھا۔

"تو ایسے کتنے اسسٹنٹ ہیں اُن کے پاس"

"دس بارہ تو ہوتے ہی ہیں"

"سب ہی کام کرتے ہیں۔؟"

"جی"

"تو تم لوگوں کو کوئی بڑا کام نہیں ملتا" امّی نے پوچھا۔ "ایسے چھوٹے موٹے کام تم لوگ کب تک کرتے رہو گے"

"وہ تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔ اس نے اسی اعتماد سے کہا "سب کو اسی طرح شروعات کرنی پڑتی ہے رفتہ رفتہ آدمی کو تھوڑا بہت تجربہ ہوتا ہے پھر کہیں اُسے چانس ملتا ہے۔"

"تم لوگ سب ایک ہی زبان بولتے ہو کیا۔ چانس، اسٹرگل"
امّی ہنسیں۔

"یہ ہمارا تمنا ہے اور جاوید بھی بس ہر دوسرے جملے میں یہی
لفظ دوہراتے رہتے ہیں۔"
اسسٹنٹ بھی ہنسا۔

"یہ آپ صحیح کہہ رہی ہیں" اُس نے کہا۔ "ہماری زبان بہت مختصر
ہے۔ ٹیکنیکل زبان کی طرح۔ ہر لفظ کے معنی ہم خوب سمجھتے ہیں۔ موقع
موقع سے اُس کی پوزیشن کیسے بدلتی ہے، اور وہاں اس کا کیا مطلب
ہوتا ہے۔"

"تم خود کیوں نہیں کرتے کام فلموں میں، تم تو اچھے خاصے ہو"
"آیا تو ہیرو بننے ہی تھا۔ وہ خوش دلی سے بولا۔
"پھر"

"بس چانس نہیں ملا۔ کس کس کو چانس ملے گا۔ روز ہی دس
پانچ نئے لڑکے آجاتے ہیں۔ بس جس کی قیمت اچھی ہوئی، یا کوئی سفارش
لگ گئی، تو سمجھو وارے نیارے ہو گئے ورنہ تو واپسی کا ٹکٹ بھی
مشکل ہو جاتا ہے۔"

"اچانک انہیں احساس ہوا کہ ہم لوگ واپس آچکے ہیں اور
ان کی گفتگو سن رہے ہیں۔ درشن رائے کا اسسٹنٹ کھڑا ہو گیا۔

"تو کیا طے کیا آپ نے؟" اُس نے شہلا سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے میں چار بجے آجاؤں گی۔"

"اچھا ماں جی چلتا ہوں۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

"کارڈ دے دیا ہے آپ کو" اس نے تپائی پر رکھے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"شہلا نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

"او کے" اس نے جاتے جاتے مجھ سے ہاتھ ملایا "سی یو اگین"

"دیکھئے شہلا جی ٹھیک وقت پر آجائیے" اس نے دروازے پر پلٹ کر ایک بار پھر شہلا سے کہا۔ "درشن جی وقت کے بڑے پابند ہیں۔"

"ہاں ہاں، آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور آجاؤں گی۔"

وہ تو چلا گیا۔ مگر ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔

"تمہاری قسمت زوروں پر معلوم ہوتی ہے" میں نے کہا "اگر درشن نے سائن کر لیا۔ تو تمہیں دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں گی۔"

"میں کچھ نہیں سوچتی پاپا" شہلا مسکراتی ہوئی بولی۔ "مجھے تو اور اختلاج ہوتا ہے۔" اسی شام شہلا کسی سہیلی کے گھر جانے کے لئے تیار ہو کر نکل ہی رہی تھی کہ جاوید بھائی آگئے۔ انہوں نے آتے ہی شہلا کو مبارک باد دی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں خبریں افواہوں کی طرح پھیلتی ہیں" جاوید بھائی ہنستے ہوئے بولے۔

"یہ سمجھو کہ درشن رائے کا اسسٹنٹ جہاں جہاں گیا ہے۔ خبرنامے کا کام کیا ہے۔"

"کہیں موہن کمار ڈسٹرب نہ ہو جائے" شہلا نے کہا۔

"ارے یہ تو اور اچھا ہوا۔ اب موہن کمار کی اور بھی دل چسپی بڑھ جائے گی۔" جاوید بھائی نے کہا: "تمہارا کام تو سمجھو اب ہو ہی گیا۔"

"آپ تو پہلے ہی سے خیالی طوطے مینا بنانے شروع کر دیتے ہیں" شہلا نے کہا۔

"ابھی تو میں درشن رائے سے ملی بھی نہیں۔"

اس شام جاوید بھائی نے کئی تازہ نظمیں سنائیں۔ بہت سارے لطیفے سنائے۔ کچھ کتابوں سے کچھ حقیقی زندگی سے، کچھ فلمی واقعات، کچھ گھریلو باتیں، جاوید بھائی نے اُس شام ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ شہلا کی کامیابی ایسا معلوم ہوتا تھا ہم سب کی کامیابی ہے۔

اس شام کے کئی عکس میں ذہن کے اسکرین پر دیر تک دیکھتا رہا۔ اس وقت ذہن بھی کسی قدر واضح اور صاف ہے۔؟

چودہ

تین بجے سے شہلا نے سنورنا شروع کیا تو تیار ہوتے ہوتے چار بج گئے۔ کم از کم دس بار تو اُس نے ساڑی بدل ہو گی۔

"اے لڑکی آخر وہ کریپ کا شلوار قمیض کیوں نہیں پہن لیتی۔؟ امی نے کہا۔

"نہیں امی شلوار قمیض میں تو میں بالکل بچی نظر آتی ہوں۔"

"اے تو بچی نہیں پھر کیا ہو؟ یہ لڑکی ابھی سے ایسی باتیں کرتی ہے کہ

مجھے تو ہول ہووے ہے۔"

وہ شام بھی ہمارے لئے ایک عجیب شام تھی درشن ایک عجیب و غریب ڈائرکٹر تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ بڑا اصاف گو منہ پھٹ فلمی دنیا کے افراد میں جو برائیاں عام طور سے پائی جاتی ہیں ان میں سے کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اس میں نہ ہو مگر اس میں بھی اُس کا ایک سلیقہ تھا۔ اور سلیقہ کیا معمول کہیے۔

جیسا کہ مجھے شہلا نے بعد میں بتایا وہ پونے پانچ بجے ہی پہنچ گئی تھی۔ مگر درشن نے اُسے پانچ بجے ہی بلایا۔ خلافِ توقع وہ بڑی خوش مزاجی سے ملا۔ یا ممکن ہے کہ وہ آفس میں سب سے اُسی طرح ملتا ہو۔

"آج کچھ ایسا مصروف رہا کہ کھانے کا موقع نہیں ملا۔" درشن نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

اُس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا۔

"دیکھو، رامو کچھ کھانے کو ملے گا کیا۔؟"

"ساب آملیٹ، بھیجا، ٹباٹا وڑا مل جائے گا۔"

"ہم نے تو ابھی دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ یہ آملیٹ اور بھیجے سے کیا ہوگا۔" درشن نے اس سے کہا۔ "یہاں تو پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔"

"بڑی مصیبت ہے۔ یہاں نزدیک میں کہیں ڈھنگ کا ہوٹل نہیں۔" وہ شہلا سے مخاطب ہوا۔ "اور صبح سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ باتوں باتوں میں یہ وقت ہو گیا۔"

سکریٹری دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔

"ورجندر صاحب آئے ہیں"

ورجیندر صاحب آئے۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور کرسی میں دھنس گئے۔

"صبح سے انتظار ہے آپ کا" درشن نے کہا "اسی انتظار میں کہیں گیا نہیں۔ کئی پروگرام کینسل کر دیئے۔ اسکرپٹ تیار ہوئی یا نہیں؟"

"بس پوری ہی سمجھئے۔ دو چار سین رہ گئے ہیں۔ دو چار روز میں کر دیتا ہوں"

ورجندر صاحب بولے۔

"جلدی لاؤ بھئی۔" درشن رائے نے کہا۔ "ابھی تو بہت کام باقی ہے۔ اسکرپٹ پر تبادلۂ خیال کب ہوگا۔ وہ سین آپ کب سُنا رہے ہیں جو پورے ہو چکے۔"

"آپ جب کہیں" ورجیندر نے پھر ہاتھ جوڑے "میں خود اسی لئے آیا تھا۔"

"تو ایسا کرو کل دس وقت آجاؤ"

"جو حکم" ورجیندر نے کہا "ایک بہت اچھا کلائمکس ذہن میں آیا ہے۔"

"ٹھیک ہے اُس پر بھی کل گفتگو ہوگی" درشن رائے نے کہا۔ "اسٹوڈیوز بک ہو چکے تین گانے بھی ریکارڈ ہو گئے ہیں۔ بس اب شوٹنگ شروع کر دینی ہے۔"

"بس میں دو دن میں پوری کر کے دیتا ہوں درشن جی۔" ورجیندر

نے کہا۔ ایک۔ ذرا سا کام تھا۔ کچھ۔"

"آپ کل آجایئے،" درشن نے کہا "پےمنٹ کی فکر نہ کریں۔ اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ کل ضرور آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"درشن جی۔ ایک بہت سخت ضرورت تھی ورنہ۔!!"

درشن رائے اُس کی بات۔ ان سنی کر کے اُٹھ گیا۔

"آؤ شہلا باہر چلتے ہیں۔ کچھ کھا پی لیں گے۔ اطمینان سے گفتگو بھی ہو سکے گی۔"

شہلا اور درشن رائے باہر نکل آئے۔ ورجیندر منہ لٹکائے دیکھتا رہ گیا۔

پندرہ

درشن رائے گاڑی خود چلا رہا تھا۔ راستے میں وہ شہلا سے ادھر اُدھر کی باتیں بھی کرتا رہا اور مشورے بھی دیتا رہا۔

"موہن نے شوٹنگ شروع کی یا نہیں" اس نے پوچھا۔

"نہیں شوٹنگ تو ابھی شروع نہیں ہوئی" شہلا نے جواب دیا۔

"ایک دن بھی نہیں؟"

شہلا نے سر کے اشارے سے نہیں کہا۔

"پھر کیا کیا ہے۔ اُس نے؟"

"جی وہ اسکرین ٹیسٹ لیا ہے"

"اسکرین ٹیسٹ؟"

"جی، انہوں نے کہا کہ یہ تو محض ایک رسمی چیز ہے ورنہ چانس تو وہ مجھے دے ہی رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض وقت گذاری کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ وہ اس طرح وقت گذارتا رہے گا۔ شاید کسی فنانسر کو پھانس بھی لے۔ دو چار ریل بن کر فلم ڈبے میں بند ہو جائے گی۔"

وہ شہلا کو دیکھ کر مسکرایا۔

شہلا کچھ نروس ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ گاڑی سگنل پر رکی تو اس نے اس کے کندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کسمسائی مگر اس قدر نروس ہو رہی تھی کہ کچھ نہ کر سکی۔

"میرے بارے میں تم نے بہت باتیں سنی ہوں گی" سگنل بدلتے ہی، درشن نے گیر بدل کر گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

شہلا محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"بات صرف اتنی ہے کہ جو کچھ بھی کرتا ہوں کھلے عام کرتا ہوں، کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ آج تک کسی کا ایک روپیہ مجھ پر باقی ہو کوئی کہہ نہیں سکتا۔ کبھی کبھی دیر ضرور ہوئی ہے۔ مگر پے منٹ کے بارے میں میں بہت پرٹیکولر ہوں۔" شہلا سنتی رہی۔

"آج تک میری جتنی بھی فلمیں سیٹ پر گئی ہیں سب مکمل ہوئی ہیں۔"

ہوٹل کی میز پر بیٹھتے ہی درشن رائے نے وہسکی کا آرڈر دیا۔

"تم لو گی؟"

"جی نہیں" شہلا نے کہا۔ شہلا کے اوسان اب بھی جگہ پر نہیں تھے۔

"نئی ہو نا" درشن نے کہا "تم ابھی نئی ہو، میرے مطلب کی کمپنی نہیں دے سکتیں۔ مگر تم سے گفتگو کرنی تھی۔"

بیرا گلاس لے آیا۔ شہلا کے لئے درشن رائے نے کولڈ ڈرنک منگوالی۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ مگر شہلا نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے شراب درشن رائے کے معدے میں جارہی ہے۔ وہ تازہ دم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے چہرے پر تکان کے آثار معدوم ہوتے چلے گئے۔ درشن رائے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا۔ اُس کی ایک فلم سیٹ پر جانے والی تھی۔ اور دوسری فلم کی سکرپٹ پر کام شروع ہو چکا تھا۔

دوسرے پیگ کے بعد وہ ایک بالکل مختلف آدمی تھے

"شہلا صاف بات تو یہ ہے کہ تمہارے چہرے میں بڑی جان ہے۔ تمہیں بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر چہرہ فلم کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چہرے پر بڑا اعتماد جھلکتا ہے۔ جسم تھوڑا دبلا ہے مگر میری کہانی کی جو ڈیمانڈ ہے اُس کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ تمہارا چہرہ، بات کرنے کا ڈھنگ، عمر میرے کردار کی ضرورت کے مطابق ہے۔"

اِن باتوں کے ساتھ ساتھ شہلا کی گھبراہٹ ختم ہوتی چلی گئی۔ ہوٹل کی مدھم روشنیاں، ہلکے سُروں میں بجتی موسیقی ائرکنڈیشنڈ

کی خنکی، درشن رائے کی باتیں اُس کے تنے ہوئے اعصاب کو دھیرے دھیرے کھول رہی تھی۔ اُس نے خود کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جیسے کسی کشتی میں بیٹھی ہو۔ جو ہلکورے لیتی ہوئی ہولے ہولے بہتی چلی جا رہی ہو۔

"تمہیں اپنے بالوں کا اسٹائل بالکل بدلنا ہوگا۔" درشن رائے کی آواز میں زور تھا جیسے حکم دے رہا ہو۔

وہ کچھ ہڑبڑا سی گئی۔

"جی"

"ہاں شہلا" درشن مسکرایا۔ "بالوں کا یہ انداز تمہارے چہرے کے لئے بالکل مناسب نہیں۔ اب تم ایک گھریلو لڑکی نہیں فلم سٹار ہو۔ ہماری ہیئر ڈیزائنر دیکھنا تمہاری شخصیت کو کیسے تبدیل کر دیتی ہے۔ تم خود آئینہ دیکھو گی تو حیران ہو جاؤ گی۔"

درشن رائے کا اس طرح اس میں دلچسپی لینا شہلا کو بڑا عجیب لگا تھا۔ وہ ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، جیسے کیمرے سے جھانک رہا ہو

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنی فلمی زندگی اسسٹنٹ کیمرہ مین کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اس لئے میری عادت ہو گئی ہے کہ جب بھی کسی کو دیکھتا ہوں تو کیمرے کے زاویے سامنے آ جاتے ہیں۔ کیمرے میں جھانکے بغیر میں بتا سکتا ہوں کہ تمہارا کلوز اپ کیسا آئے گا۔ سائڈ سے کیسی لگو گی۔ کلوز اپ میں تمہاری آنکھیں چھوٹی معلوم ہوں گی۔ انہیں بڑا کرنے کے لئے خاص طور سے میک اپ کرنا ہوگا۔ سائڈ سے تم بہت اچھی لگو گی۔ البتہ بالوں کو ذرا کان

کے اوپر لے لینا ہوگا۔ پورا نہیں تھوڑا سا۔"

شہلا کو اس سے الجھن ہونے لگی۔ اتنی بے باکی سے بلکہ لاپروائی سے کوئی اُسے دیکھ کر ایسے ریمارکس پاس کرے گا۔ اُس نے شاید ہی کبھی سوچا ہو۔ مگر درشن اس قدر اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا کہ اُسے زمین اپنے پیروں تلے سے سرکتی معلوم ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ اگر چند روز بھی اِس شخص کے ساتھ سروکار رہا تو یہ شخص اُسے بالکل بدل کر رکھ دے گا۔ لڑکیاں اسٹار کیسے بنتی ہیں شاید اب اُسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ فلمی پرچوں میں درشن رائے کے بارے میں ایسی کئی باتیں مشہور تھیں۔ وہ جب ہیروئن کو سائن کرتا تھا اس کی مرضی کے مطابق ڈھلی چلی جاتی تھی۔ درشن رائے کو سفید رنگ پسند تھا۔ ہیروئن بھی جب شوٹنگ کے لئے جاتی سفید ساری میں جاتی۔ ایک خاص طرح کا ہیر اسٹائل اُسے بہت پسند تھا۔ ہیروئن جلد ہی اپنا ہیر اسٹائل بدل دیتی۔ اور تو اور وہ اُردو شاعری کا پرستار تھا۔ ساحر کی کئی نظمیں اُسے زبانی یاد تھیں۔ کئی ہیروئنوں نے اسے خوش کرنے کے لئے اُردو کے ٹیوشن رکھ لئے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اُسے درشن رائے کی گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ دماغ بار بار اُسے سنبھلنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ مگر اس کی باتوں میں ہلکی شراب کا سا سرور تھا جو اُسے سنبھلنے نہیں دے رہا تھا۔ ایرکنڈیشنڈ ماحول، ہلکی موسیقی، مدھم پرسکون روشنیوں اور ہوٹل کے بے حد خاموش ماحول نے بھی جیسے اُس کی قوتِ مدافعت چھین لی تھی۔ اور سچ بات تو یہ تھی کہ اُس وقت اُس کا جی سنبھلنے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ باتیں میں نے خود سُنی تھیں جب شہلا فوزیہ اور آپا کو اس ملاقات کا حال سُنا رہی تھی۔ یہ باتیں شہلا نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔ مگر جب

اُس نے اس ملاقات کا حال فوزیہ کو سُنایا تو پوری تفصیل سے بیان کیا۔میں گیلری میں بیٹھا تھا اور وہاں تک شہلا کی بلند آواز بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ باتوں کے جوش میں شاید اُسے خود بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اُس کی آواز بلند ہو گئی ہے اور میں گیلری میں بیٹھا ہوا ہوں۔ درشن سے گفتگو کرتے ہوئے اُسے یہ خیال ضرور تھا کہ درشن ایک کامیاب ڈائریکٹر اور پروڈیوسر تھا۔ اُسے فلمی دنیا کے تمام نشیب و فراز سے آگاہی تھی اور وہ کسی پر مہربان ہو جائے تو اس کی قسمت جگمگا سکتی تھی۔

ڈرنکس کے بعد درشن نے کھانا منگوایا۔ سات بج رہے تھے۔ کھانا ختم کر کے اُس نے درشن سے درخواست کی کہ وہ اُسے گھر پر چھوڑ دے۔

درشن نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"تم کسی بھی زاویے سے فلمی لڑکی نہیں لگتی ہو۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شہلا نے کہا۔ "ابھی تو میں صرف کوشش کر رہی ہوں۔"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"نئی لڑکیوں کے ساتھ یہی جھنجٹ ہوتی ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ اچھا موڈ بن گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ ذرا کمرے پر چلتے۔ ایک آدھ فلم وی۔ سی۔ آر پر دیکھتے۔ کچھ غپ شپ ہوتی۔ شام تو اب تباہ ہو ہی گئی۔"

"آپ اپنے کسی ساتھی کو فون کر لیجئے۔" شہلا نے کہا۔

"ہاں وہ تو میں کروں گا ہی۔" درشن نے کہا "مگر اتنا اچھا موڈ بنا تھا وہ تو خراب ہو گیا نا۔ اچھا چلو تمہیں چھوڑ دوں۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ اُسے کھڑا ہوتے دیکھ کر بیرا دوڑ کر بل لے آیا۔ درشن رائے نے ایک نظر بل پر ڈالی اور سو سو کے دو نوٹ ٹرے میں ڈال دیئے۔

"میں اکیلی ہی چلی جاتی ہوں۔"

درشن نے رُک کر ایک لحظہ کو سوچا۔ پھر بولا۔

"نہیں میں چھوڑ دیتا ہوں،" درشن نے کہا۔

"وہاں سے شیریں کا گھر نزدیک ہے۔ اُسے لے لوں گا۔"

شیریں فلموں کی رقاصہ تھی۔

واپسی میں درشن نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ البتہ جب گھر قریب آیا تو اُس نے کہا "معاف کرنا میں صاف گو آدمی ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے نئی لڑکیوں کے ساتھ کام کرنے سے الجھن ہوتی ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ موہن کمار کے ساتھ تھوڑا بہت تو تم نے اس ماحول کو سمجھ ہی لیا ہو گا۔ اچھی یا بُری میری کچھ عادتیں ہیں۔ اب اس عمر میں تو میں اہنیں بدلنے سے رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں بدلنا بھی نہیں چاہتا۔ دن بھر سر کھپانے کے بعد آدمی کچھ دیر ریلکس (relax) ہونا چاہتا ہے۔ تم ابھی تک اس ماحول سے مانوس نہیں ہوئی ہو۔ کہا ہے کہ اداکار ہدایت کار کے ہاتھوں میں ایک میڈیم ہوتا ہے۔ وہ اس سے جیسے چاہتا ہے کام لیتا ہے، تمہارے ساتھ کام کرتے میں مجھے بڑی دشواری ہو گی۔ نئی لڑکیوں کے ساتھ کام کرنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اس لئے برسوں سے میں ایسی لڑکیاں لیتا آیا ہوں جو یا تو دو تین فلموں میں کام کر چکی ہوں یا کم از کم ایسی لڑکی ہو جو میری مرضی کے خلاف نہ جائے۔ جب میں سیٹ پر کام کرتا ہوں

تو کسی قسم کی اڑچن پسند نہیں کرتا۔ مجھے غصّہ بھی بہت جلد آتا ہے۔ البتہ سال چھ مہینے میں جب بھی تم اِس فلمی ماحول سے ایڈجسٹ ہو جاؤ مجھ سے ضرور ملنا۔ میں تمہیں ضرور کام دونگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

باتیں کرتے کرتے گھر آچکا تھا۔ درشن گاڑی کھڑی کر چکا تھا۔ آخری جملے کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ شہلا نے سر کے اشارے سے اُسے خدا حافظ کہا۔

سولہ

شہلا گھر میں داخل ہوئی تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ بخار کی سی کیفیت تھی۔ ہم سب اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ امّی نے اُسے تشویشناک نظروں سے دیکھا۔ سب منتظر تھے کہ وہ کچھ کہے۔ مگر شہلا نے کچھ نہیں کہا۔ ہلکے سے پیشانی کو دباتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں بس تکان ہو گئی ہے۔ ذرا سر درد کر رہا ہے۔"

امّی نے آپا سے کھانا نکالنے کے لئے کہا۔

شہلا اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی۔

"کپڑے بدل کر فوراً آجاؤ۔" امّی نے کہا "میں کھانا گرم کروا رہی ہوں۔"

"کھانا تو میں کھا چکی۔ درشن صاحب کے ساتھ"

"درشن کے ساتھ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں انہوں نے دوپہر میں روٹی نہیں کھائی تھی۔ اس لئے ہم لوگوں نے ہوٹل میں ساتھ ہی کھایا۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ شہلا کو بات کرنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔

"درشن نے کیا کہا۔" ؟ میں نے تجسّس سے پوچھا۔

شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ارے اس کی حالت نہیں دیکھ رہا ہے"۔ امّی نے کہا۔ "سب باتیں ابھی ہی کرے گا۔ کل صبح پوچھ لینا۔ جا بیٹی تو سو جا آرام سے۔ سر درد کی گولی رکھی ہے۔ منّے ذرا گولی تو کھلا دے اس کو۔ دیکھ میری سنگاردان کی دراز میں رکھی ہے۔"

"نہیں نہیں، میں گولی نہیں لوں گی، بس ذرا تھکان سی لگ رہی ہے"

اس کا چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔ ہم بھی خاموش ہو گئے۔

کتنا نادان لگا میں ؟ میں سمجھ رہا تھا۔ کامیابی بس یوں ہی مل جاتی ہے۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ دنیا میرے قدموں میں ہوگی کوئی سخی آئے گا اور تمام مطلوبہ چیزیں طشت میں رکھ کر پیش کر دے گا۔ کہ نوجوان یہ چیزیں تمہارے ہی جیسے لائق اور ذہین نوجوانوں کے لئے ہیں۔ گاڑی، فلیٹ، شہرت، عزت اور دولت سب میرے قدموں میں پڑے ہوں گے۔ پتہ نہیں میں کس چمتکار کا

منتظر تھا۔ اب اپنی معصومیت پر رونا آتا ہے۔ مگر اُس وقت کسے پتہ تھا کہ اِن چیزوں کے لئے بہت کچھ گنوانا پڑتا ہے۔ غیرت، حمیت عزتِ نفس۔ بغیر سب کچھ لئے دُنیا کسی کو کچھ نہیں دیتی۔

ذہن کا اسکرین اچانک خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ پھر یہ کون سوچ رہا ہے؟ اگر میں ہوں تو پھر میرے ہاتھ پیر اور دوسرے اعضا کہاں گئے؟ پتہ نہیں یہ دماغ کے خلئے بھی سچ مچ ہیں یا یہ بھی میرا واہمہ ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں البتہ یہ سچ ہے۔ وقتاً فوقتاً عکس میری نظروں کے سامنے سے گزرتے جاتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے۔ پھر یہ سوچنے والا کون ہے۔ یہ تصویریں واقعی ہیں یا محض میرا تصور؟ اگر یہ میں ہی سوچ رہا ہوں تو پھر بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے کہ یہ سوچ بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اپنے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر پتہ نہیں کب، کتنے وقفے سے ذہن جیسے اچانک کھٹ سے روشن ہوتا ہے اور تصویریں سامنے سے گزرنے لگتی ہیں۔

مجھے پھر اپنے ہونے کا احساس ہوا ہے۔ میرے آس پاس خلا ہے، ایک اندھا خلا۔ ایک روشن لکیر کہیں اور سے آ رہی ہے۔ اور اچانک ایک تصویر اُبھر آئی ہے۔ یہ فوزیہ کی تصویر ہے۔ وہ دلہن بنی ہوئی ہے پھر یہ تصویر مٹی ہے اور دوسری تصویر روشن ہوئی ہے۔ یہ امّی ہیں، یہ آپا۔ یہ شہلا کا چہرہ ہے۔ وہ گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ اب ذہن جیسے پوری طرح بیدار ہو گیا ہے۔ یہ صفدر نعمانی بیٹھے ہیں۔ امّی اپنی پلنگڑی پر ہیں۔ شہلا صوفے پر بیٹھی ہے۔ میں دیوار سے

ٹیک لگائے کوئی سستا سا ناول ہاتھ میں لئے بیٹھا ہوں۔

"چائے پیئیں گے، صفدر بھائی" شہلا صفدر رنعمانی سے کہہ رہی ہے۔

اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما گیا ہے۔

"کیوں نہیں۔ ضرور پیئیں گے" وہ خوشی سے کہہ رہی ہے۔

"بھلا تم پلواؤ اور نہ پیئیں۔ مگر پہلے پانی پلواؤ۔ بڑے زوروں کی پیاس لگ رہی ہے۔"

شہلا نے پانی لاکر دیا ہے۔ اور چائے بنانے کے لئے چل ہے۔ مگر آپا نے روک دیا ہے۔ تم بیٹھو، میں بنا لاتی ہوں۔

"بھئی بڑے ہنگامے ہیں آج کل شہلا کے نام کے" صفدر بھائی کہہ رہے ہیں "میری لڑکی نے کیا بگاڑا ہے کسی کا" امّی غصّے میں سُرخ ہو گئی ہیں "وہ غریب نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ یہ لوگوں کے کیوں مرچیں لگ رہی ہیں!"

"آج کل جس کے گھر چلے جاؤ۔ یہی چرچا ہے" صفدر بھائی کہہ رہے ہیں۔ کہ شہلا فلموں میں کام کر رہی ہے۔"

"اے تو کر رہی ہے تو کچھ ان کا دیا تو نہیں کھا رہی، ہم ہی کھلا رہے ہیں اُسے۔" امّی کہہ رہی ہیں۔ "ہم تو نہ گئے کسی کے پاس۔ الٹا ہمارا ہی کچھ نہ کچھ نکل آوے گا اِن پر۔ کچھ بس نہ چلا تو اب میری لڑکی کے پیچھے پڑ گئے۔"

امّی روہانسی ہو گئیں۔

"شنو خالہ نے کہا ہو گا۔" میں نے کہا تھا۔

"نہیں، کنجن خالہ کہہ رہی تھیں کہ دیکھو کیا زمانہ آگیا ہے، وہ خاندان جس کی عورتوں کے پیر کے ناخن دکھائی نہ دیویں تھے اُس کی لڑکی اب اسکرین کے پردے پر دندنائے گی۔ ہزاروں تماش بینوں کے سامنے" صفدر بھائی نے کہا۔ "انہوں نے تو کچھ اور کہا تھا۔ مگر وہ الفاظ میں آپ کے سامنے دوہرا نہیں سکتا۔"

مارے غصے اور شرم کے شہلا کا چہرہ لال، بھبوکا ہوا اٹھا۔ میری کنپٹیاں خون سے سنسنا گئیں۔ امی کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا۔

صفدر صاحب خود ایک لمحے کو بھونچکا رہ گئے کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ پھر سنبھلے اور مسکرا کر بولے۔

"مگر میں نے بھی کنجن خالہ کو خوب آڑے ہاتھ لیا۔"

ہم سب اُن کا منہ تکنے لگے۔

میں نے کہا کنجن خالہ، اب رہنے بھی دو"۔ صفدر بھائی بولے "ہمیں سب معلوم ہے۔ آپ لڑکی نسرین کی شادی کے لئے ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ ہم ہی جانتے ہیں۔"

کنجن خالہ کی لڑکی، نسرین کا قصہ گزشتہ دس برسوں کا سب سے گمبھیر واقعہ تھا۔ وہ محلے کے کسی قصائی کے لڑکے کے ساتھ نکل گئی تھی۔ مگر چار دنوں ہی میں اتنے اختلاف ہوئے کہ گھر واپس آگئی۔ کنجن خالہ نے صفدر بھائی کے ہاتھ پیر جوڑ کر کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے کروا دیئے تھے۔ اس طرح کے کئی کیس تھے۔ جو وقتاً فوقتاً حوالوں کے طور پر استعمال ہوتے رہتے تھے۔ اور سب کی کور دبی رہتی تھی۔

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

"شہلا ! ذرا چائے لے لے،" آپا نے کہا"میں کیتلی چڑھا آئی تھی پانی کھول رہا ہو گا۔"

کچھ ہی دیر میں شہلا چائے لے آئی۔

صفدر بھائی نے اپنی موٹی انگلیاں چٹخائیں، بائیں ہاتھ کی انگلی میں پھنسی سونے کی انگوٹھی کو دوسرے ہاتھ سے سرکاتے ہوئے بولے۔

"میں نے کنجن خالہ سے کہہ دیا کہ خالہ اب زمانہ بدل رہا ہے اب ان باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اب وہ گاؤں کی باتوں کو آپ بھول جایئے۔ آپ اب شہر میں ہیں اور وہ بھی ہندوستان کے سب سے بڑے شہر میں یہاں تو آپ کو ادھر کے طریقے ہی اپنانے پڑیں گے۔ ورنہ لوگ کہیں گے کہ یہ دیہاتوں کے رہنے والے شہری طور طریقے کیا جانیں۔"

کنجن خالہ بیچ کر بولیں

"تو کیا اپنی لڑکیوں کو فلموں میں کام کرنے بھیج دیں۔؟"

"ہم نے ان سے کہا کہ خالہ اب کچھ کہو مگر آرٹ کی قدر تو کرنی ہی پڑے گی۔" چائے پیتے پیتے مجھے مارے ہنسی کے اچھو لگ گیا۔ میں کھاگا موری کی طرف۔ شہلا نے اپنا منہ ڈوپٹے میں ٹھونس لیا۔ خیریت گزری کہ صفدر بھائی کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ ان کا رومال کرسی کے ہتھے سے پھسل کر نیچے گر پڑا تھا۔ وہ اُسے اٹھا رہے تھے۔

اس شام امّی نے صفدر بھائی کو بڑی محبت سے کھانا کھلا کر بھیجا۔

بعد میں سب اُن کی باتیں یاد کر کے دیر تک ہنستے رہے۔

سترہ

اگلے روز میں اسٹوڈیو گیا تو موہن کمار بہت اچھے موڈ میں تھا۔ حسبِ معمول کئی آدمی آس پاس بیٹھے تھے۔ کیمرہ مین ریڈی بھی بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو مسٹر سعید۔ آپ کا سسٹر کا پکچرس بہوت فرسٹ کلاس آیا ہے"۔

اُس نے اپنے اسسٹنٹ سے تصویریں لانے کے لئے کہا۔

تصویریں واقعی بہت اچھی آئی تھیں۔ میں نے رسماً ریڈی کا شکریہ ادا کیا۔

"یہ تو صرف ایک جھلک ہے"۔ موہن کمار نے کہا۔ "فلم میں دیکھنا، ایک ہی فلم میں شہلا اسٹار نہ بن جائے تو میرا نام بدل دینا"۔

اُن کی باتیں سُن کر مجھے خوشی ہوئی۔

"ایسا کرتے ہیں۔" موہن کمار نے کہا "ایک ڈسٹری بیوشن کمپنی تمہیں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس فلم کو بمبئی میں ریلیز تمہاری ہی کمپنی سے کرائیں گے۔"

میرا سینہ گز وں کھول گیا۔ جس خوش نصیبی کی میں اتنے دنوں سے راہ دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ یہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے

خواب بس اب پورے ہونے ہی والے ہیں

کئی نئے آرٹسٹ کام کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔ موہن کمار اُن سے گفتگو کرنے لگے۔ کسی سے کہا کہ فلم شروع ہو جانے پر آنا۔ کئی ایک زیادہ قریبی تھے اُن سے کہا گیا کہ ایک آدھ مہینے کے بعد چکر لگاؤ۔ فلم کی کاسٹنگ میں ان کے لئے تو بہر حال جگہ نکالنی ہی ہے۔

"آپ کی یہ نئی فلم کا موضوع کیا ہے؟" ایک شخص نے پوچھا۔ جو نہرو جیکٹ پہنے ہوئے بڑی دیر سے خود کو دانشور ظاہر کرنے کی کوشش میں تھا۔

"کہانی پر ابھی کام چل رہا ہے۔ سوشل تھیم ہے،" موہن کمار نے پان چباتے ہوئے کہا "کرائم کے بھی دو ایک سین ہیں۔ مگر بنیادی طور پر تھیم سوشل ہے۔ کئی سین پھر سے لکھوا رہا ہوں۔ کئی منظر ایسے ہیں جن سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ سوچتا ہوں ان پر بھی پھر سے ڈسکشن ہونی چاہیئے۔"

انہی باتوں میں دوپہر ہو گئی۔ موہن کمار کے گھر سے ٹفن آیا رکھا تھا۔ میں نے اجازت چاہی۔

"کیا بات ہے آج کل جلدی چلے جاتے ہو؟" اُس نے کہا۔

"نہیں تو،" میں جھینپ گیا "میں تو گھر ہی جا رہا تھا۔"

"تو شام میں چلے جانا" موہن کمار نے کہا۔ پھر ہنستا ہوا بولا۔ "ریڈی کہیں ایسا تو نہیں کہ سعید کو ہمارا کھانا پسند نہیں آیا؟"

"آپ بھی موہن جی کیسی باتیں کرتے ہیں۔" میں اور خفیف ہو گیا۔

"اب تو شانتا سے کہنا ہی پڑے گا" موہن کمار نے کہا۔
شانتا اُس کی بیوی کا نام تھا۔
میری انا کو اس بات سے کس قدر تقویت ملی تھی کہ موہن کمار مجھے اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ خیال میرے ذہن سے محو ہو گیا کہ میں ان پر خواہ مخواہ بار ہو رہا ہوں۔ شاید یہ موہن کمار کی عادت تھی۔ ہر پروڈیوسر کی طرح وہ دو چار آدمی ہمیشہ پاس میں رکھتے تھے۔ میرے ساتھ انہیں یہ بھی آرام تھا کہ انہیں کوئی تنخواہ دینی ہی نہ تھی۔ مگر اس وقت یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔
کھانے سے فارغ ہو کر ہم بیٹھے ہی تھے۔ کہ ایک شخص بہت ہی اپٹوڈیٹ قسم کا ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ صورت شکل سے دونوں جنوبی ہند کے معلوم ہوتے تھے۔ موہن کمار اُس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ انہیں کرسی پیش کی گئی۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ وہ شخص انجینئر تھا، اور کسی اچھی کمپنی میں بہت اچھی تنخواہ پر ملازم تھا۔ لڑکی بھی تعلیم یافتہ تھی۔ جنوبی ہند کے نقوش، کھلتا ہوا صندلی رنگ، بھرا بھرا کھوپرے کی طرح ملائم اور سخت جسم۔ لڑکی کو رقص اور اداکاری کا شوق تھا۔ اسٹیج پر وہ ایک ڈراموں میں کام بھی کر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد موہن کمار نے اشارہ کیا اور ہم لوگ آفس سے باہر نکل آئے۔ بیس پچیس منٹ بعد وہ دونوں باہر نکلے اور ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمستے کرتے ہوئے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد موہن کمار نے میرے علاوہ

دوسروں کو بھی رخصت کر دیا اور چائے منگوائی۔ کئی دنوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا ہم دونوں اس طرح تنہا مل رہے تھے۔

"یار فلم کا تو سمجھو پورا کام ہو ہی چکا ہے۔" موہن کمار نے مجھ سے کہا "اسکرپٹ میں تھوڑا سا کام ہے اُسے اس مہینے پورا کر لیتے ہیں۔ اگر تھوڑا بہت کام رہ بھی گیا۔ تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ شہلا کو ٹرینڈ کرنا ہوگا۔ وہ میں دیکھ لوں گا۔ اسکرپٹ کی ایک کاپی شہلا کو بھجوا دیں گے۔ ریہرسل میں سمجھا دوں گا۔

بیرا چائے لا کر رکھ گیا موہن کمار خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چہرے کے تاثرات ایسے تھے، جیسے سوچ رہا ہو۔ چائے پیتے پیتے اچانک رُک کر وہ بولا۔

"سعید، یہ لڑکی تم کو کیسی لگی۔؟"

"کون سی"

"ارے یہی جو ابھی آئی تھی"۔

"اچھی تھی۔ خوبصورت!"

موہن کمار ہنسا۔

"اچھی کیا بہت اچھی لڑکی ہے" اس نے کہا "سالڈ (SOLID) چیز ہے۔ اس سے زیادہ کھرا تو سکہ بھی نہیں ہوسکتا، لیکن ایک بات پر تم نے غور نہیں کیا ہوگا۔؟"

"کس بات پر؟"

"اسکرین فیس نہیں ہے۔" موہن کمار پھر ہنسا۔ ڈائریکٹر کی

اور عام آدمی کی نگاہ میں یہی فرق ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے ساتھ رہو گے تو سیکھ جاؤ گے، یہ باتیں تجربے سے آتی ہیں۔ یہی چیزیں تو سیکھنے کی ہوتی ہیں۔"

"پھر آپ نے اُن سے کیا کہا۔؟"

"صاف بات تو یہ ہے کہ ان کا دل توڑنے کو میرا جی نہیں چاہا پھر دونوں خاصے ماڈرن ہیں۔"

موہن دائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔

"تو آپ انہیں کام دیں گے؟"

"ڈانس تو وہ کر ہی لے گی۔" موہن کمار نے کہا۔ "فی الحال میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ رول دوں یا نہ دوں، مگر لڑکی مجھے پسند آئی۔"

یہ موہن کمار اسی صاف گوئی سے گفتگو کر رہا ہے جو شہلا سے ملاقات سے پہلے اُس کی روش تھی۔ ویسے بھی شاید وہ زیادہ دیر تک خود کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ یا وہ شائستگی کا بھرم رکھتے رکھتے اکتا چکا تھا۔ بہرحال جو بات بھی ہو۔ اب وہ اپنے اصلی انداز میں آ گیا تھا۔

"اور اگر میں کام دینا ہی چاہوں۔" موہن کمار نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو یقین جانو اس لڑکی کو۔ پردے پر اس طرح لا سکتا ہوں کہ تم پہچان ہی نہ پاؤ۔ میک اپ کیا چیز ہوتی ہے کسی دن تمہیں ہم دکھائیں گے۔"

"ہاں ایک کام کرو۔" اُس کی آواز میں تحکم تھا۔ "میں نے دونوں سے بات کر لی ہے۔ یہ لوگ سائن میں رہتے ہیں۔ ٹھیک نو بجے تم

وہاں سے لڑکی کو لے لینا۔ وہ اکیلی تمہارے ساتھ آئے گی۔ ٹیکسی میں ہوٹل لے آنا۔ دو بجے تم پھر لڑکی کو سائن واپس چھوڑ آؤ گے۔ پیسوں کی فکر مت کرنا۔ لو یہ رکھ لو۔"

اُس نے جھک کر دراز میں سے ایک بنڈل نکالا۔ اور اس میں سے سو کا نوٹ مجھے دیا۔ میں نے ایک تنویمی کیفیت میں نوٹ اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اب تم جاؤ" اس نے کہا "پیر تم میں تم سے ملاقات ہو گی۔ یہ کارڈ رکھ لو" میں نے کارڈ پر چھپا نام پڑھا۔ ٹی۔ چندرا کانت۔ سول انجینئر۔ کارڈ جیب میں رکھ کر ۔۔۔ میں کسی مشینی پتلے کی طرح باہر آگیا۔

اٹھارہ

اسٹوڈیو سے باہر آکر بجائے اس کے کہ میں گھر کا رخ کرتا، قریب کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ مجھے سوچنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ مجھے بس اتنا خیال تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ میں نے چائے منگوائی اور سوچنے لگا کہ سو روپے کا نوٹ مجھے لینا ہی نہیں چاہیئے۔ یہ تو سچ تھا کہ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے، اور اس قسم کی باتیں عام تھیں۔ مگر اُس نے مجھے کیوں استعمال کیا۔ وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ جیسے میں اس کا ملازم ہوں۔ اور اُسے

معلوم ہو کہ میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ رہ رہ کر مجھے یہی غصہ آ رہا تھا اِس غلیظ کام کے لئے کیا میں ہی رہ گیا تھا۔؟ مگر مجھے معلوم تھا کہ میں جاؤں گا ضرور۔ اس نے مجھے ڈسٹری بیوشن کی آفر جو دی تھی۔ پھر وہ شہلا کو چانس دے رہا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ بھینس کسی بھی وقت پانی میں جا سکتی تھی۔ مگر میں نے اپنے سارے خیالی قلعے اِنہیں موہوم وعدوں پر تعمیر کر رکھے تھے۔ انکار کرنے کی مجھ میں طاقت ہی کہاں تھی۔ اور وہ بے وقوف کیوں اس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ یہ انڈسٹری بھی عجیب ہے۔ یہاں باپ خود بیٹی کا سودا کرتا ہے میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا سر کسی دیوار سے دے ماروں۔ آخر ان باتوں کا حاصل کیا تھا؟ ذہن کمار کی فلم کا کیا بھرتہ بنتے بنتے۔ اس کی کئی فلمیں چار پانچ ریل بن کر ڈبوں میں بند پڑی تھیں۔ ایسے احمقوں کی بھی تعداد کم نہ تھی جو فلم بنانا چاہتے تھے۔ فلموں میں پیسہ لگانا چاہتے تھے۔ ذہن کمار جیسے لوگ جن سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ درشن رائے تو ایسے لوگوں کے مقابلے میں مجھے فرشتہ معلوم ہوا۔ کم از کم اس کا حساب کتاب تو صحیح تھا۔ دھوکہ تو نہیں دیتا تھا۔

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں پوری چائے ختم کی اور باہر نکل آیا۔

اُنّیس

اِسی کشمکش خیال میں اُلجھا میں گھر پہنچا۔ آپا اور امی شام کے کھانے کی تیاریوں میں جٹے تھے۔ شہلا عورتوں کا کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کتاب بند کر دی، شاید اُسے بھی اپنے سکرین ٹیسٹ کے نتیجے کا انتظار تھا۔ میرا جی چاہا اور مجھے یاد ہے کہ میں یہ کہنے کو ٹھہر بھی گیا کہ موہن کمار ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ مگر نہیں کہہ سکا۔ پتہ نہیں کونسی موہوم اُمید اب بھی مجھے سہارا دیئے ہوئے تھی۔ آدمی کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تنکے کے سہارے دریا پار نہیں کیا جا سکتا وہ سہارا لئے بنا نہیں رہتا۔ یہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکلا تو یہ کہ موہن کمار کی فلم شاید اگلے مہینے سیٹ پر چلی جائے تمہاری، تصویریں بہت اچھی آئی ہیں۔ تصویریں میں لے آیا تھا وہ میں نے اُسے دے دیں۔ کچھ دیر تک، وہ بھی تعجب سے اپنی تصویریں دیکھتی رہی پھر آپا کے پاس دوڑ گئی، انہیں تصویریں دکھانے کے لئے۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یہ بات میں نے اُسے نہیں بتائی کہ موہن کمار ریہرسل کے لئے اُسے بلانے والے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس لڑکی کے باپ اور میری صورتِ حال میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ مگر میں جتنا اُس پر سوچنے کا جتن کرتا میرا ذہن ماؤف ہوتا جاتا، یا کسی اور طرف بہک جاتا۔ جبکہ میں چاہتا تھا کہ اس پر ٹھہر کر سوچوں غور

کروں۔ شاید میں خود کو تسلی دینے کے لئے راہ نکالنا چاہتا تھا۔ مگر میرا ذہن مجھے موقع نہیں دے رہا تھا۔ دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں تو میں نے خود ہی اس خیال کا تعاقب ختم کر دیا۔ کچھ دیر بعد شہلا چائے لائی اور میرے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چائے سے اعصاب کو کچھ راحت ملی مگر شہلا سے گفتگو کا میرا بالکل بھی موڈ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے منے بھائی، آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں نے ٹالا۔ "یونہی بس سر درد کر رہا ہے۔ موسم کا اثر ہوگا۔" حالانکہ موسم بہت شاندار تھا۔ صاف، اُجلا شفاف دن درجۂ حرارت معتدل، موسم تو اتنا پیارا تھا کہ دوستوں کے ساتھ کہیں نکلا جائے سمندر کنارے، کسی باغیچے میں، یا پھر کچھ نہیں تو فلم ہی دیکھی جائے مگر ذہن پر بس ایک ہی خیال سوار تھا کہ اس لڑکی کو نو بجے سائن سے لینا ہے۔

"آپ کا چہرہ کچھ اُترا ہوا لگ رہا ہے۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

شہلا چلی گئی۔ میں یونہی اخبار کو اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ پھر جھنجھلا کر پھینک دیا۔ اپنی حالت پر رہ رہ کر مجھے طیش آرہا تھا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ فون کر کے انجینئر کو صحیح پوزیشن بتا دوں۔ اُس کا کارڈ مجھے موہن کمار نے دیا ہی تھا۔ اس خیال سے میں اٹھا اور قمیض پہنی مگر پھر سوچنے لگا اگر اُسے یقین نہ آیا تو ہو سکتا ہے وہ کچھ اور ہی سمجھ بیٹھے۔ فون پر بہر حال اتنی باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ باتیں تو بالمشافہ ہی ممکن تھیں۔ ایک بات البتہ میں نے طے کر لی کہ کم از کم ایک

میں اُسے پوری بات ضرور سمجھاؤں گا۔ چاہے آگے کچھ بھی ہو۔ اس خیال سے کچھ سکون ملا۔ میں نے اُٹھ کر ہاتھ منہ دھویا شہلا کو پھر سے چائے بنانے کے لئے کہا۔ سر درد کی ایک ٹکیا بھی لی۔ سات بجے سر کا درد غائب ہوا۔

بلیس

چندر کانت کے فلیٹ پر میں ایک گھنٹہ قبل ہی پہنچ گیا۔ مکان بڑی آسانی سے مل گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی وہ ایک بڑی کالونی میں رہتا تھا جیسے ہی میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا اُس نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے کالونی دکھائی۔ کالونی کے چوکیدار سے بلڈنگ کی بھی نشاندہی ہو گئی۔

"ساب چوتھا مالے پر چلے جاؤ، لفٹ سے" چوکیدار نے کہا "انجنیئر ہے نا۔ بہت فیمس ہے ادھر"

وہ لوگ میرے جلدی آنے پر بڑے حیران ہوئے۔

"ہم نے تو نو بجے کا وقت دیا تھا!" اُس نے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔ میں خود ہی ذرا جلدی آگیا۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں!"

"کون سی باتیں؟" چندر کانت اب بھی کچھ پریشان تھا۔ کیا ملاقات ملتوی ہو گئی ہے۔"

"نہیں، وہ تو طے ہے۔ میں خود ہی آپ سے کچھ گفتگو کرتا

چاہتا تھا۔"

"اچھا۔ اچھا" اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "شانتا تم تیار ہو تب تک میں ان سے گفتگو کرتا ہوں۔ اور ہاں اپنی ماں سے کہو ذرا چائے بھیج دے۔"

شانتا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے بھی کچھ اطمینان ہوا۔ اب میں آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا۔

"انجینئر صاحب آپ تو بہت صاف اُردو بولتے ہیں" میں نے تھوڑی بے تکلفی پیدا کرنے کے لئے کہا۔ "کیا آپ واقعی جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں۔"

انجینئر خوشی سے ہنسا۔

"بات یہ ہے کہ ملازمت کے تقریباً تیس سال میرے دلّی اور یو۔ پی میں گزرے ہیں۔ پچھلے دس سال سے میری پوسٹنگ دلّی میں تھی۔ بمبئی آئے ابھی ہمیں مشکل سے ایک سال ہوا ہے۔ میری لڑکی بھی اُردو بول لیتی ہے۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ شانتا کے لئے اردو کا ایک ٹیوشن بھی رکھ لوں۔ انڈسٹری میں اُسے کافی فائدہ ہوگا۔ کیا خیال ہے۔؟"

"بالکل، بالکل،" میرا جی چاہا میں خود اپنی خدمات پیش کر دوں۔ "اکثر لڑکیاں تلفظ میں گڑبڑ کر جاتی ہیں۔ خالی کو کھالی اور غلطی کو گلتی سن کر موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" انجینئر صاحب نے تائید کی۔

ملازمہ شربت کا گلاس لے کر آئی۔

"لیجیے، نوش فرمائیے" انجینئر نے کہا۔

اپنے آقا کو اردو بولتے دیکھ کر ملازمہ کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے فخر سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہو۔

شربت دودھ میں بنا تھا۔ فرج میں ٹھنڈا کیا ہوا۔ اوپر ملائی کی تہہ جمی ہوئی۔

"بڑا عمدہ شربت ہے" میں نے کہا۔

"شکریہ، اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ آپ جلدی آئیں گے تو ہم کچھ اور بھی بندوبست کرتے" اس نے خوشدلی سے کہا

میں مسکرا دیا۔ اس نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"ہاں تو کیا نام بتایا آپ نے۔"

"سعید"۔

"تو سعید صاحب آپ نے وجہ نہیں بتائی آنے کی۔" انجینئر نے کہا۔

"میں تو گھبرا ہی گیا تھا کہ کہیں ملاقات ملتوی نہ ہو جائے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ موہن کمار فلم بنائیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

"کیوں نہیں بنائیں گے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو فلمیں بنا چکے ہیں نا۔"

"جی بیس سال میں۔" میں نے کہا۔

"بیس سال میں؟"

"جی ہاں، اور پچھلے آٹھ سال سے ان کی کوئی فلم ریلیز نہیں

ہوا ہے۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ کئی فلمیں بن رہی ہیں ؟"

"جی ہاں تین فلمیں اناؤنس ہوئیں اور دو یا تین ریل بننے کے بعد بند ہو گئیں اور ایسی فلمیں جو صرف کاغذی کارروائی تک محدود رہیں، وہ تو کئی ہوں گی۔ جب کوئی نیا فنانسر پھنستا ہے، نیا رنگ آجاتا ہے۔ نئی نئی لڑکیاں آتی ہیں اور موہن کمار جی کے عیش ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ تو موہن کمار کے آدمی ہیں نا ؟" انجینئر نے شک اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "اور آپ ہی ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ؟"

"بات یہ ہے چندر کانت صاحب آپ ایک معزز، اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شانتا بھی ڈبل گریجویٹ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اسٹوڈیو میں تو ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر بس یونہی ہوتے ہیں۔ آپ تو بہت اونچے گھرانے سے ہیں۔ اس لئے مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے سوچا آپ کو کم از کم آگاہ کر دوں۔ آگے آپ جیسا مناسب سمجھیں۔"

"آپ کو یقین ہے کہ فلم نہیں بنے گی ؟" اس نے پوچھا۔

"جی بالکل" میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتایئے آپ سے انہوں نے کوئی وعدہ کیا ہے۔"

"نہیں، وعدہ تو نہیں کیا۔"

"اس کے باوجود آپ اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہیں ؟"

انجینئر کا چہرہ اتر گیا۔

"دراصل میری لڑکی کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ خوبصورت بھی ہے، رقص بھی کر سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا تو ضرور کامیاب ہوگی۔ آپ کی باتیں میں سمجھ گیا ہوں۔' اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔ ان باتوں پر میں نے بھی بہت سوچا ہے۔ دراصل ہم ہندوستانی بہت قدامت پسند ہوتے ہیں،" اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی جیسے میرا ردِّ عمل دیکھ رہا ہو، پھر کمرے میں لگے جھومر کو تاکتے ہوئے بولا "ہم لوگ بہت دیر میں بدلتے ہیں۔ اب زمانہ کافی بدل گیا ہے۔ جنس کی اب وہ اہمیت نہیں رہی جیسے پہلے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بھی زندگی کا بہت لطف اٹھایا ہے۔ اور جس سوسائٹی میں ہم لوگ رہتے بستے ہیں اُس میں بھی اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میری لڑکی بھی ان باتوں کو مائنڈ نہیں کرتی۔"

اب حیران ہونے کی میری باری تھی۔ جس اعتماد سے اور بیباکی سے چندر کانت گفتگو کر رہا تھا اُس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔ وہ تو مجھے ہی بے وقوف سمجھ رہا ہوگا۔ صبح سے میں خواہ مخواہ ہی پریشان تھا۔ اب مجھے صرف اس بات کا رنج تھا کہ موہن کمار نے مجھ سے یہ غلیظ کام کیوں لیا۔ مگر ظاہر ہے اُس کے نزدیک اس کی اہمیت کیا تھی۔ کل کو اس کا فنانسر اس سے کہتا تو وہ خود یہاں آکر شانتا کو لے جاتا۔

"بہر حال میں نے جو کچھ محسوس کیا، آپ کو بتا دیا۔ آپ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو اندھیرے میں نہ رکھوں۔"

چندر کانت سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ یہ چہرہ ایک دنیادار بزنس مین کا چہرہ تھا۔ بالکل عملی۔ اپنی لڑکی کو وہ پورے کاروباری ذہن سے فلموں میں لانے کے لئے کوشاں تھا۔ وہ پہلے ہی حساب لگا چکا تھا کہ اگر اس کی لڑکی کامیاب ہوگئی تو وہ لاکھوں روپے بنائے گا۔ اور لڑکی تو اس کے زیر نگیں تھی ہی۔ لڑکی کی اہمیت اس کے نزدیک ایک سونے کا انڈہ دینے والی مرغی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو ہر چیز کو انوسمنٹ کے حساب سے سوچتا تھا۔ جذباتی رشتے اس کے نزدیک بے معنی ہو چکے تھے۔ اُس کی لڑکی ایک پروڈکٹ تھی جسے بازار میں چلانا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

دس منٹ بعد وہ آیا تو کافی ہشاش بشاش تھا۔ شاید وہ سب حساب کتاب لگا چکا تھا۔

"آپ کی بات میرے دل کو لگتی ہے" اُس نے کہا۔ "جب اُس نے آٹھ سال میں ایک بھی فلم نہیں بنائی تو اب کیا بھروسہ کہ فلم بنائے گا یا نہیں"

"پھر آپ نے کیا طے کیا؟"

"میں نے اب اپنی لڑکی پر چھوڑ دیا ہے۔" اُس نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "اب وہ جو فیصلہ کرے۔"

چلو کچھ تو اثر ہوا۔ میں نے سوچا۔ میری محنت رائیگاں نہیں

گئی۔

لڑکی آئی تو کافی اپ سیٹ نظر آرہی تھی۔ اُس نے بڑے غصّے سے مجھے دیکھا، جیسے میں ہی موہن کمار ہوں۔ مگر جلد ہی نارمل ہو گئی۔

"آپ کا شکریہ" اُس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا "دراصل ہمیں ان باتوں کا علم نہیں کہ یہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔"

وہ میرے سامنے رکھے صوفے پر دھنس گئی۔ اتنے نزدیک سے اس کے خد وخال مجھے کچھ اور ہی کہتے نظر آئے۔ قریب سے دیکھنے پر وہ مجھے پختہ عورت معلوم ہوئی جنس نا آشنا تو وہ ہرگز نہیں تھی۔

اُس کے باپ نے تامّل میں اُس سے کچھ کہا۔ جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر لڑکی نے اُسے انگریزی میں جواب دیا کہ وہ نہیں جا رہی ہے۔ اُس کی دلچسپی ختم ہو چکی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ کسی وجہ سے میں نہیں آسکی۔"

"بس یہی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، کچھ بھی بہانہ کر دیجئے گا کہہ دیجئے کہ ہم لوگوں کو اچانک دلّی لوٹنا پڑا۔ یا پھر ــــ"

"آپ ان سے سیدھے سیدھے کہہ دیجئے کہ" انجینئر نے اُس کی بات کاٹی۔

"اُن کی لڑکی پیریڈ میں ہے یہ چندر کانت کو معلوم نہیں تھا اور وہ کل آپ سے خود فون پر گفتگو کریں گے۔"

"ٹھیک ہے،" میں اُٹھ گیا۔

دونوں نے بظاہر ہنستے ہوئے مگر بباطن سخت کوفت کے ساتھ

مجھے رخصت کیا۔ ظاہر ہے اُن کا سارا منصوبہ دھرا رہ گیا تھا۔
باہر نکلتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ انہیں درشن سے ملتے کے لئے کہوں مگر پھر موہن کمار کی بات یاد آئی کہ لڑکی کا اسکرین فیس نہیں ہے۔ اور درشن تو بالکل ہی صاف گو آدمی ہے

ہوٹل شبنم پر موہن کمار میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ شانت کیوں نہیں آئی تو اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ اُس نے تابڑ توڑ دس بارہ گالیاں اُسے اور اُس کے باپ کو دے ڈالیں، پھر کہا۔
"اچھا تم جاؤ۔" میں یہیں ہوٹل سے کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ اب ادھر آ ہی گئے ہیں تو۔ اور کچھ کہا اس تخم حرام نے۔"
"جی نہیں بس اتنا کہا ہے کہ وہ کل فون کریں گے آپ کو یا خود ملنے آئیں گے۔"
"حرامزادے کو جب سب کچھ پتہ تھا تو یہ بھی تو اپنی لڑکی سے پوچھ سکتا تھا۔ اور وہ چھنال کیوں چُپ تھی۔"
"ممکن ہے یہ تکلیف بعد میں ہوئی ہو۔" میں نے ہنسی ضبط کر کے بھولے انداز میں کہا۔
ہوٹل سے باہر آ کر میں بہت ہنسا۔ دن بھر کی کوفت ختم ہو چکی تھی۔ ذہن میں بہت سے سوالات سر اُبھار رہے تھے۔ میں نے سوچا اب کل ہی سوچیں گے اطمینان سے۔ اس بات کا اندازہ تو

مجھے ہو ہی گیا تھا کہ میں بالو پر اپنے مکان کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔ اپنی خوش فہمی پر مجھے بھی ہنسی آنے لگی تھی مگر سمجھ میں نہ آیا تھا اور کیا کر دوں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں موہن کمار سے چپکا ہوا تھا۔ زندگی بیکار ضائع ہو رہی تھی مگر اس کی فکر کسے تھی۔ غفلت اس غضب کی تھی، اور نشہ اتنا تیز کہ بھولے بھٹکے ان باتوں کا خیال بھی آجاتا تو میں اُونہہ کر کے جھٹک دیتا۔

اِس وقت جب یہ تصویریں چشم تصوّر میں یا پتہ نہیں کہاں، بہرحال میرے سامنے سے گزر رہی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ چندر کانت کی باتوں نے میرے دماغ کو کس بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ میں شہلا کو موہن کمار کے گھر جانے سے منع کر دیتا مگر پتہ نہیں میری زبان کیوں سِل گئی تھی۔ جب شہلا موہن کمار کے گھر ریہرسل کے لیئے گئی تو وہ چاہتی تھی کہ میں ساتھ رہوں مگر میں کسی بہانے غائب ہو گیا۔ میرا خود پر سے اعتماد متزلزل ہو چکا تھا۔ جو کچھ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ سب بے کار معلوم ہوتا تھا۔ یہاں ترقی کے زینے اور ہی تھے۔ میں شہلا کی رہنمائی کیا کرتا۔ مجھے خود رہنمائی کی ضرورت تھی۔ میں سوچنے لگا کیا پتہ چندر کانت سچ ہی کہتا ہو۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جنس کا تصوّر جاگیرداری سماج کی دین ہے۔ ممکن ہے صحیح ہو۔ اتنے سب لوگ جو اس قدر تجربہ کار ہیں، مختلف میدانوں پر چھائے ہوئے ہیں کیا غلط ہو سکتے ہیں؟ یہ بہرحال سرمایہ داروں کی دنیا ہے۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلنے کے لیئے بنا رہے ہے۔ اس سماج کی اقدار ہی دوسری ہیں۔ ان میں جاگیرداری نظام کی قدروں

کو بیٹنے سے بچائے بیٹا ایسا کیسے ممکن ہے بابا ۔ میں شہلا سے اصرار کرتا اگر یہ ظلم و ستم کا چکر چھوڑ دو تو وہ یقیناً چھوڑ دیتی کہ اس کے نزدیک مجھ پر دانشمندی ختم تھی ۔ میری فکر میں ۔ پوری شدت سے کہ چاہتا تو اُسے حکم دے سکتا تھا کہ فسادوں کا خیال دل سے نکال دے میں دیکھ رہا تھا کہ بڑے بڑے نگر مچھ اس چھوٹی سی خوبصورت مچھلی کو نگلنے کے لئے تیار ہیں ۔

یہ تو شہلا کی زندگی کے حسین ترین دن تھے ۔ اس کے دن بدن نکلتے قد کو دیکھ کر امی کو ہول ہونے لگا تھا ۔ بات بے بات ، ہائے ننگے سر ابھی نہا کر نکلی ہے ۔ چیخنے لگتیں ۔ لڑکی ذات ، ابا مارے گا کیا گھوم رہی ہے ۔ بال کیوں نہیں بناتی ۔ یہ تیرا دوپٹہ کہاں جا رہا ہے ۔ تیرے دیدے کیسے پھٹے پڑے ہیں ۔ بات بے بات ہنستی رہتی ہے ۔ اور امی کی باتوں سے جدا ۔ میں اس کی مترنم ہنسی پیانو کے گیتوں کی طرح فضاؤں میں بکھرتی پاتا ۔ اُسے مجھ پر پورا بھروسہ تھا ۔ امی کو بھی امید تھی کہ میں اُس کا خیال رکھوں گا ۔ کہ میری حالت اس جاسوس کی سی جو کراس کر گیا ہے ۔ میں تو خود بکھر رہا ٹوٹتا بکھرتا جا رہا تھا ۔ بس مجھ میں اعتراف کی ہمت نہ تھی ۔ خود سے بھی نہیں دوسروں کی بات تو الگ رہی ۔ یہ تصویر اُس رات کی ہے جب باہر سے گھر آکر روٹی کھائے بغیر بتی بجھائے اپنے کمرے میں لیٹ گیا تھا ۔ پاس کے کمرے سے شہلا کی آواز آرہی تھی ۔ وہ آپا کو موہن کمار سے اپنی ملاقات کا حال سنا رہی تھی ۔

اس کا مکان ڈھونڈنے میں مجھے دقت نہیں ہوئی ۔

کوئنس روڈ کے علاقے میں داخل ہوتے ہی چار پانچ بلڈنگوں کے

بمبئی ہے وہ۔ باہر پھول والے ٹوکریاں لئے بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں دوسری قسم کے پھلوں کی ٹوکریاں لئے بیٹھے تھے۔ ایک شخص اخبار اور رسالے بیچ رہا تھا۔ ہر دوسری بلڈنگ پر بینر چپکے ہوئے۔ کوئی نہ کوئی کی زنجیر کرتا ہے۔ اتنا فیشن ایبل علاقہ پھر بھی ایسا اداس سا ماحول تھا۔ جب میں نے لفٹ مین سے ساتواں منزلہ کہا تو اس نے اندر دوسرے لوگوں نے بڑی عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کسی ایسی ویسی لڑکی کو دیکھتے ہیں۔ میرا تو چہرہ ہی اتر گیا۔ اسی موڈ میں میں لفٹ سے باہر آ گئی۔ تھوڑی دیر فلیٹ کے باہر کھڑی رہی۔ اتنی اونچی بلڈنگ اور ایسا اسٹائل تھا۔ زینے سے جھانکنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ کتنی اونچائی پر آ گئے ہیں۔ بیٹھے دل سے میں نے کال بیل دبائی۔ موہن کمار نے خود دروازہ کھولا۔ اور مسکرا کر بولا۔

”آئیے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا“

کمرہ بڑا خوبصورت سجا ہوا تھا۔ جگ مگ جگ مگ کرتا۔ کھڑکیوں پر قیمتی دبیز پردے لگے تھے۔ ایر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک کا احساس کمرے میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا۔

موہن کمار نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پیچھے رکھے شیلف میں سے فائلوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ موٹا موٹا سا جسم، بال جگہ جگہ سے اڑ گئے تھے۔ پیچھے سے چاند صاف نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے عیاری بھی لگتی تھی اور رعونت بھی برستی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا رائے قائم کی جائے۔ پھر میں دھیان بٹانے کے لئے دوسری چیزیں دیکھنے لگی۔ ایک کونے میں

ایک خوبصورت نیم برہنہ عورت کا سفید چینی کا مجسمہ رکھا تھا اور سامان بہت کم تھا۔ ایک دیوار پر کپ بورڈ۔ ایک میز، دو صوفے ایک ڈبل بیڈ۔ پھر خیال آیا کہ میں یہاں اکیلی ہی ہوں اور میں کچھ نروس ہو گئی۔ خدا کرے اس ملاقات کا انجام بخیر ہو۔ میں نے سوچا۔
آخر ایک فائل نکال کر وہ مڑا۔ "معاف کیجئے جو فائل چاہیے تھی وہ مل نہیں رہی تھی"۔ ایر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک سے میرے اعصاب سُن ہونے لگے۔

"آپ ۔۔۔ آپ کہانی سمجھانے والے تھے"۔ میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو ہے ہی مگر آپ پہلی بار آئی ہیں"۔ اُس نے کہا "ٹھیک سے تواضع ہونی چاہیئے۔ ورنہ آپ کیا سوچیں گی"۔

"جی نہیں، اس میں تواضع کی بھلا کیا بات ہے"، میں نے کہا۔

"آپ نے ڈرنک تو شروع نہیں کی ہو گی اب تک"۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"جی نہیں" میں نے اُس سے کہا۔ دل میں کہا کہ اور ارادہ بھی نہیں ہے۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں لے لوں"۔

میں نے سوچا یہ مصیبت کی جڑ یہاں بھی ہے۔ مگر کیا کہتی۔ منع کر دیتی؟ میں نے کہا۔ "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ کا گھر ہے"۔ آیا میرے ذہن میں تو اسی وقت ۔۔۔ سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں تھیں۔ صوفے میں ایک جانب دو تین درازیں تھیں۔ ان میں سے ایک دراز کھول کر اس نے دو گلاس تپائی پر دھر دیئے

میں نے پوچھا۔

"یہ وہ کینڈل:"

"ادنت جو ٹھہری"

گلاس اس نے دوبارہ دراز میں نہیں رکھا۔ پھر نیچے کی بڑی دراز کھولی۔ اس میں شراب کی بوتل تھی۔ تقریباً نصف بھری ہوئی۔ بوتل اور گلاس کو ہی دیکھ کر وہ اتنا خوش ہو رہا تھا۔ پھر صوفے کے پیچھے دیوار میں لگا بٹن دبایا۔ یہ کال بیل تھی۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی داخل ہوا۔ عمر پینتالیس پچاس کی ہوگی۔

"جادھو، کیک، پیسٹری وغیرہ لائے یا نہیں۔ تم سے کہا تھا لانے کے لئے۔"

اس نے موہن کمار کو خاموشی سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ بھی کیا الو بنا رہے ہیں۔

"اچھا تو ایسا کرو تم جلدی سے یہ سب چیزیں لے آؤ۔"

جادھو نے کاہلی سے کہا "نیچے سے لانا پڑے گا۔"

"ہاں ہاں" تو لے آؤ نا۔ اور ہاں چائے بھی بنا لاؤ۔"

میں نے سوچا کہ یہ تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ بولتا ہی رہتا ہے۔ آج یہ ایسی حرکتیں کیوں کر رہا ہے۔ ہر بات ایسے کیوں کر رہا ہے جیسے سوچ سوچ کر کہہ رہا ہو۔ کیا امپریشن ڈالنا چاہتا ہے یا کوئی اور بات ہے۔ میں بھی اندر محتاط ہو گئی۔ وہ پھر فائل الٹ پلٹ کرنے لگا۔ دو تین منٹ کے بعد پھر کھنکھار کر بولا۔

"تو شہلا یہ ہے فلم کی اسکرپٹ" اور اسکرپٹ میری طرف سرکا کے سگریٹ سلگا لیا۔ دو تین کش لگائے پھر بڑے مزے سے اٹھ کر میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا۔" یہ آپا پوچھ رہی ہیں۔

"واہ، کیسے نہ لگتا، مگر میں بھی بظاہر ہمت سے بیٹھی رہی۔

"مجھے تو اس میں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے ورق الٹتے ہوئے اُس سے کہا۔ واقعی اُس میں عجیب عجیب سے جملے تھے۔ ہر ایک جملے کے بعد ایکشن جیسے وہ گلاس اٹھا کر تپائی رکھتا ہے پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ کیمرہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ کلوز اپ۔ پھر دوسرا شاٹ کھڑکی سے نیچے راستے پر بس ایسی ہی الم غلم باتیں اُس میں لکھی ہوئی تھیں۔

"وہی میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔" اُس نے کہا "خیر ہٹاؤ۔ اسکرپٹ کو۔ اسکرپٹ سے یوں بھی پورا تاثر سمجھ میں نہیں آتا۔ اداکاری، کہانی کا بلڈ اپ، فوٹوگرافی یہ چیزیں اسکرپٹ میں روح پھونک دیتی ہیں۔ اندراصل ذہن ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر کا کیمرہ کہاں رکھنا ہے۔ سین کیسے لینا ہے۔ کہاں میں کیا چیز رکھنی ہے۔ کیا نکالنی ہے۔ کس سے کیا کام لینا ہے۔ کلوز اپ کب آنا چاہیے لانگ شاٹ کب آتا ہے۔ یہ سب تو ڈائریکٹر ہی کرتا ہے۔" اس کی باتوں سے میں سچ مچ مرعوب ہو گئی۔ میں اتنے غور سے سن رہی تھی کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اس کا چہرہ میرے بالکل نزدیک آ گیا ہے اُسی وقت اُس کا ملازم چائے، بسکٹ لے کر اندر آیا۔

بچے اتنا پیارا لگا۔

"اور کچھ۔ پیجئے" وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"نہیں، تم جاؤ۔"

"صاب، ہم ذرا بازو کی بلڈنگ سے آتا ہے۔" اُس نے کہا

موہن کمار نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے رخصت ہونے کے لئے

کہا۔

وہ چپ چاپ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے ہونے سے

تھوڑا بہت سہارا تھا، میں نے سوچا۔ دیر بھی گیا۔ ادھر ائر کنڈیشنر

سے میرا دماغ ایسا ہو رہا تھا کہ اب سویا کہ تب سویا۔ میں نے سوچا

اس سے ائر کنڈیشنر بند کرنے کو کہوں مگر چپ رہی۔

"چائے لیجئے۔" موہن کمار نے کہا۔

میں نے کپ میں تھوڑی سی چائے لی۔ دو گھونٹ لے کر رکھ

دیا۔ پھر بسکٹ لئے، چائے سے بڑا آرام ملا۔ دماغ کچھ کھلا۔ میں نے

جلدی جلدی پوری چائے پی لی۔ اندر وہ ایک پیگ ختم کر کے دوسرے

پر آ گیا تھا۔

"آپ کا رول بہت پیچیدہ ہے" وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "محبت یا

حسد یا نفرت، غرض یا ہر طرح کے جذبات اس میں اُبھر کے آتے

ہیں۔"

"کہانی کا آئیڈیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی مختصر سی یہ ہے شہلا کہ کالج کا ایک ذہین اور ہونہار

لڑکا ہے۔ تعلیم کے دوران ایک امیر لڑکی سے اس کی دوستی ہوتی ہے۔

لڑکی غلطی سے اُسے محبت سمجھتی ہے۔ لڑکا تعلیم مکمل کر کے ایک فرم
میں مینیجنگ ڈائرکٹر ہو جاتا ہے۔ یہ فرم اس لڑکی کے باپ کی ہے۔
ایک بار [illegible] ملاقات ایک اور لڑکی سے ہوتی ہے اور
وہ اُس پر فدا ہو جاتا ہے۔ لڑکی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہیرو
نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ وہ اس کی راہ میں کانٹے
بچھاتی ہے۔ مگر پھر اُسے اپنی حرکتوں پر ندامت ہوتی ہے۔
اور ہیرو کو ویلن سے بچانے میں جو کمپنی کو اپنے قبضے میں کر کے
اُس کے باپ کو بے دخل کر دینا چاہتا ہے، خود کو قربان کر دیتی
ہے۔ اُس لڑکی کا رول آپ کو کرنا ہے۔"

"یہ تو بڑا مشکل رول ہے" میں نے کہا۔

"ہاں شہلا، رول تو واقعی مشکل ہے۔ کئی ہیروئنوں نے
مجھے اس کے لئے آفر بھی دی ہے۔ مگر میں نے پہلے ہی سوچ رکھا
تھا کہ میں کسی نئے چہرے کو لے کر یہ فلم بناؤں گا۔ کیا ہے، مشکل
کو آسان بنانے میں مجھے مزا آتا ہے۔ یہی تو چیلنج ہے ڈائرکٹر
کے لئے۔ میرا خیال ہے اگر تم نے ہمت سے کام لیا اور میری
ہدایت کے مطابق کام کرتی رہیں تو پہلی فلم سے ہی اسٹار بننا
یقینی ہے۔ اور اس کا کریڈٹ مجھے جائے گا کہ انڈسٹری کو میں نے
ایک خوبصورت ذہین اور کامیاب اداکارہ دی ہے۔"

موہن کمار کا تیسرا پیگ چل رہا تھا۔ اور اُسے نشہ یقیناً
ہو چکا تھا۔ "یار اور چائے بناؤ۔ تم تو کچھ لے ہی نہیں رہی
ہو۔" مجھے اُس کے بے تکلف لہجے پر بڑی حیرت ہوئی۔ مگر

میں ذائقے سے پہچان پانے لگی۔ ائرکنڈیشنڈ کی وجہ سے بڑے چبانے کی ضرورت بھی تھی۔

"ارے یہ کیک تو تم نے چکھے تک نہیں" اُس نے کہا۔

"ایک میں کھا چکی ہوں" میں نے کہا "ویسے بھی میٹھے کا مجھے زیادہ شوق نہیں ہے"۔

"تم یار بہت تکلف کرتی ہو" اُس نے کہا "کوئی بات نہیں ہم کھلائیں گے۔" ستور نے میرے منہ میں کیک زبردستی ٹھونس دیا۔

"یہ بات ہوئی نا" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

مجھے تو رونا آرہا تھا۔ مگر ائرکنڈیشنڈ میں آنسو بھی باہر آنے سے ڈر رہے تھے۔ میں نے سوچا اب اِسے تو کسی طرح سنبھالنا ہی ہوگا۔ یونہی اس کا دھیان ہٹانے کے لئے میں نے کہا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں۔ یہ رول میں کرسکوں گی"

"کیوں نہیں، اگر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں یہ رول تمہیں کیوں آفر کرتا"

"آپ کو اتنا اعتماد ہے مجھ پر"

"تم پر۔۔۔" اُس نے کہا "بلکہ اپنے آپ پر۔ میری یہ فلم سب سے زیادہ کامیاب فلم ہوگی۔ ہر اعتبار سے"

"لیکن اتنا مشکل رول میں کروں گی کیسے؟"

"ارے تم نہیں جانتیں۔ تمہارے اندر اس کی بڑی صلاحیت ہے۔ یاد رکھو، اداکاری کا ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جیسا رول ہو بس ویسی ہی بن جاؤ۔ اس میں کھو جاؤ۔ فلم میں ہی

انہیں، اُٹھتے بیٹھتے ڈیلائے پھرتے یہی سوچتی رہو۔ تمہیں خود محسوس ہوگا کہ تم خود وہ شخصیت بن چکی ہو۔ پھر جب تم کیمرے کے سامنے جاؤ گی۔ تو تمہیں ذرا بھی دقت نہیں ہوگی۔"

وہ چوکتا ہیاگ، بھرنے کے لئے بوتل اُٹھانے لگا تو میں ذرا سرک کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا۔ ایسی کمینگی تھی اُس کی نگاہوں میں۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

اُس نے گلاس میں شراب ڈالی۔ اس میں پانی ملایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کی زبان بھی اکنت کر رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"شہلا ایک بات سمجھ لو۔ آج تک جن لڑکیوں نے میری فلموں میں کام کیا ہے۔ اُن میں سے کوئی بھی ناکام نہیں ہوئی، اس کی وجہ ایک ہی تھی۔ بھروسہ۔ ان لڑکیوں کو مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب میری فلم مکمل ہوئی تو انہیں نہ صرف اداکاری کا ڈھنگ آگیا تھا بلکہ وہ فلم لائن کی ایک ایک رگ پہچان چکی تھیں۔ فلموں میں کام کیسے ملتا ہے۔ اچھا رول کیسے اُڑایا جاتا ہے، فلمی کیریئر کیسے بنتا ہے تمہیں شاید معلوم نہیں میں ایکسٹرا بھی سپلائی کرتا رہا ہوں۔ اور یقین مانو ایکسٹرا سپلائر سے زیادہ معلومات کسی کو نہیں ہوتی۔ یقین مانو میں تم کو صرف دو سال میں ٹاپ کی ہیروئین بنا دوں گا۔ مگر اُس کے لئے تمہیں مجھ پر پورا بھروسہ رکھنا ہوگا۔ انڈسٹری کے بڑے بڑے فنانسر میری جیب میں رہتے ہیں۔ سب تمہارے نام کی مالا نہ جپنے لگیں تو میرا نام سوہن گوار نہیں۔ تمام شہر میں ہر طرف تمہارے ہی پوسٹر

اس نے بڑی تیزی سے گلاس ختم کیا۔ اب وہ پورے فارم میں تھا۔ میرے تو اوسان خطا ہو رہے تھے۔ وہ ایسی گندی گندی باتیں کر رہا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ کی سردی کا احساس تو ختم ہو گیا۔ اُلٹے مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ جی میں آیا کہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔ پھر خیال آیا کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ اسی وقت پتہ نہیں کیسے مجھے منّے بھائی کی بات یاد آئی کہ موہن کمار کے بارے کچھ گلاس [illegible] کے بعد سو جاتا ہے۔ میں نے مسکرا کر بوتل اٹھائی وہ تو دیکھ کر دنگ ہی رہ گیا۔ اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دو تین بار پلکیں جھپکا کر اس نے حیرت سے مجھے اور بوتل کو دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اس کے گلاس میں شراب انڈیل دی اور کچھ زیادہ ہی ڈال دی۔ تھوڑا سا پانی ملا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ [illegible] ناپ سے پی رہا تھا میں نے [illegible] کچھ دوہری ہی مقدار گلاس میں ڈال دی تھی۔

وہ لہراتا ہوا کھڑا ہوا اور رقص کرنے لگا۔

"ڈیر یو آر [illegible] تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں جانتا تھا۔ یو آر اے جینئس۔"

وہ پھر سے بکواس کرنے لگا کہ سب فیناف رایڈ و سے مجھے جلاتے ہیں۔

"تم دیکھنا میں تمہیں کہاں سے کہاں پہنچاتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ پھر صوفے پر بیٹھا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے

بیچارے پر غنودگی چھانے لگی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مزے سے سو گیا۔ میں نے سوچا کہ جاؤ عصر ہو تو آ ہی چکا ہوگا۔ گھنٹی بجائی، وہ آیا تو میں نے اُس سے کہا "تمہارے ساب سو گئے ہیں۔ میں جاتی ہوں"۔ وہ بے چارہ میری صورت دیکھنے لگا۔ میں دروازے کی طرف بڑھی تو اُس نے آگے بڑھ کر خود دروازہ کھول دیا۔

باہر نکلی تو جان میں جان آئی مگر ٹھنڈے پسینے اب بھی چھوٹ رہے تھے۔ بس اسٹاپ پر آنے کے بعد میں نے سوچا کہ لعنت ہے ایسے شوق پر جس میں انسان کی عزت ہر وقت خطرے میں رہے۔ اب کبھی فلموں کا نام بھی نہ لوں گی۔ جب بس نہیں آئی تو میں نے سوچا آگے چوراہے پر سے بس لے لوں گی۔ وہاں سے بہت بسیں مل جائیں گی۔ مگر چلتے چلتے خیال آیا کہ پتہ نہیں کتنے دن ہے میں نہ تو کہیں تفریح کے لئے گئی ہوں نہ شاپنگ کے لئے سمندر دیکھے تو جیسے مدتوں ہو گئیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ مگر لوگ تھے کہ چلے ہی آتے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ مرکیوری قمقموں میں جگمگ کرتی ہوئی۔ بھیڑ بھاڑ افراتفری بھی بھلی لگ رہی تھی۔ راستے میں ایک جگہ پانی پوری کا ٹھیلہ لگا تھا۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ بہت دنوں بعد اس طرح لوگوں میں رل مل جانے میں بڑا مزا آیا۔"

"بابا، یہ نیرا ہی جگر ہے، اتنی سی عمر، میرا تو کلیجہ ہی بیٹھ جائے" یہ آپا کی آواز تھی۔

تصویریں پھر بدل گئی ہیں۔

یہ صفدر نعمانی، جاوید بھائی اور ہم سب بیٹھے غپ شپ کر رہے ہیں

ہیں۔ امّی کئی بار پوچھ چکی ہیں۔" شہلا اب تک نہیں آئی۔"
"آتی ہی ہوگی" میں کہہ رہا ہوں
صفدر رلغمانی کو آئے بہت دیر ہو گئی۔ مگر خلاف معمول اب تک وہ ٹلے نہیں۔ شاید شہلا کے آنے کے بعد ہی جائیں گے۔

اکیّس

شہلا آئی ہے اور گفتگو کرتے کرتے سب خاموش ہو گئے ہیں۔ اُس نے مسکرا کر سب کو سلام کیا ہے۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی ہے۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ پھر آئی ہے اور ہمارے درمیان بیٹھ گئی ہے۔ جاوید بھائی اور صفدر نے اس سے فلموں کے متعلق سوالات کئے ہیں مگر شہلا نے مذاق میں ٹال دیا ہے۔

"سبیر سین ایک نئی فلم شروع کر رہا ہے، اُسے بھی نئے چہروں کی تلاش ہے۔" جاوید بھائی کہہ رہے ہیں۔" تم ان سے کیوں نہیں ملتیں۔؟"

"اب تو جاوید بھائی میں فلموں سے ہی اُکتا گئی ہوں۔"

"کیوں ؟" جاوید بھائی کہہ رہے ہیں۔ "شروع میں تو جدو جہد کرنی ہی پڑتی ہے۔ بغیر جدوجہد کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"اب تو یہ باتیں مجھے فضول سی لگتی ہیں۔" یہاں لوگ کچھ

اور یہی چاہتے ہیں۔"

شہلا کی زبان سے یہ باتیں سُن کر سب بھونچکے رہ گئے تھے۔ صفدر لغمانی تک اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ خیریت ہوئی کہ امّی اور آپا کھانا نکالنے کچن میں گئی ہوئی تھیں۔

"سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔" جاوید بھائی نے کہا "اس سلسلے میں تمہارا تجربہ بہت محدود ہے۔"

"ہوگا، مگر اب اچھے لوگوں کو کہاں ڈھونڈا جائے۔" شہلا نے کہا "اب آپ ہی بتایئے۔"

"اس سپیرسین کو ہی لے لیجئے" جاوید بھائی نے کہا، "اسے سوائے اپنے کام کے کسی بات سے مطلب نہیں ہوتا لیکن تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ڈائرکٹر اچھا ہوتا ہے تو پروڈیوسر یا فنانسر کی ذہنیت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر یہ بھی حیران نہ کریں تو کبھی فلم کے ہیرو گلے پڑ جاتے ہیں۔"

"تو پھر آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہیئے؟"

"کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک آدمی کامیاب نہیں ہو جاتا اُسے بہت ساری پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے مگر ایک بار کامیاب ہو جائے۔ پھر کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"میرا تو اب دل ہی اُچاٹ ہو گیا ہے" شہلا نے کہا۔ "ایسے واہیات لوگ اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کسی میدان میں ہوں"

"اور اگر ہم خود فلم بنائیں؟" صفدر لغمانی نے ایسے کہا جیسے ترپ کا پتہ پھینک رہے ہوں۔ اُس روز حیرت کا یہ دوسرا حملہ

تھا۔ اب کے اس میں شہلا بھی شامل تھی امّی بھی دستر خوان بچھاتے ہوئے رُک کر صفدر بھائی کو دیکھنے لگیں۔

"اے کیا کہہ رہے ہو۔" امّی نے کہا "کچھ ہوش بھی ہے۔"

"کیوں کیا ہم فلم نہیں بنا سکتے!" صفدر بھائی مسکراتے ہوئے بولے۔

"سُنا ہے لاکھوں روپے لگ جاویں ہیں فلم بنانے میں" امّی نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم بنائیں گے۔"

"فیصلہ کر لیا ہے آپ نے؟" جاوید بھائی نے پوچھا۔

"ہاں، ہم نے تو طے کر لیا ہے اگر تم تیار ہو" صفدر لغانی بولے۔

"اس کے لئے تو بڑی تیاری کرنی پڑتی ہے۔"

"تو پھر تم لوگ... کس مرض کی دوا ہو۔" صفدر بھائی نے کہا، "ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ شہلا اس کی ہیروئین ہوگی۔ بس باقی سب تم طے کرو۔ روپیہ ہم لگائیں گے۔"

جاوید بھائی کو تو بس اشارہ چاہیئے تھا۔ فلم اسٹوڈیوز کی کینٹینوں اور آس پاس کے ہوٹلوں کی میزوں پر روز ہی ایسے بجٹ تیار ہوتے تھے۔ اور جاوید بھائی تو اس میدان کے پُرانے کھلاڑی تھے انہوں نے منٹوں میں چھوٹے بڑے کئی بجٹ بنا کر سامنے رکھ دیئے

صفدر لغانی تو کھا پی کر چلے گئے، ہماری نیندیں اُڑ گئیں۔

شہلا کی دلچسپی اداکاری میں ختم ہو چکی تھی مگر میری اور جاوید بھائی کی دلچسپی کو دیکھ کر اس نے حامی بھرلی۔ اگرچہ اس نے بار بار کہا بھی کہ آپ لوگ کوئی اچھی سی ہیروئن کیوں نہیں لے لیتے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ صفدر نعمانی تو محض شہلا کے لئے فلم بنا رہے تھے۔

شام میں جاوید بھائی اور صفدر نعمانی بلا ناغہ گھر آجاتے۔ جاوید بھائی نے کئی فلمی کہانیاں سنائیں۔ کافی ردوقدح کے بعد ایک کہانی پر صاد کر ہی دیا گیا۔ اب اسکرپٹ کا جھنجھٹ شروع ہوا۔

"یار بڑے لفڑے ہیں اس میں بھی" صفدر نعمانی نے کہا۔

میں نے سوچا کہ کہوں کہ ابھی تو ابتدا ہے مگر خاموش رہا۔

چند دنوں بعد جاوید بھائی ایک ماہر نوین جوشی کو لے آئے، ہر سین پر وہ جاوید بھائی سے ردوبدل کرنے کے لئے کہتا۔

"اگر یہ سین ایسا کریں تو فرسٹ کلاس ہو جائے گا۔"

"یہ ڈائیلاگ ذرا اس طرح کر دو۔"

"یہاں ویمپ کی انٹری ٹھیک رہے گی۔"

جاوید بھائی اس سے الجھتے، بحث کرتے مگر وہ کئی فلمی اسکرینوں پر کام کر چکا تھا۔ جاوید بھائی متواتر قائل ہوتے چلے جاتے۔ یار یہ ساہتیہ نہیں ہے۔ یہ تو بزنس ہے۔ فلم باکس آفس کے نام پر جاوید بھائی چپ سادھ لیتے کہانی رفتہ رفتہ بدلتی چلی گئی۔ ہم لوگ جاوید بھائی کی درگت دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے۔ جب کہانی مکمل ہونے کو آئی تو جاوید بھائی کی کہانی اور عام فلمی کہانیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ خود جاوید بھائی بھی مطمئن تھے۔ وہ

تو بس چاہتے تھے کہ کسی طرح فلم بن کر ریلیز ہو جائے۔ ایک بار پردۂ سیمیں پر ان کا نام جگمگاتے حروف میں آ جائے ان کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے اور انہیں اس بات کی سند مل جائے کہ ایک فلم کی کہانی اور اسکرپٹ وہ لکھ چکے ہیں۔

چند روز تو صفدر رلغانی یہ تماشا دیکھتے رہے۔ پھر ایک روز انہوں نے امّی سے کہا کہ یہ لوگ تو کہانی پر کام کرتے رہیں گے۔ ہم لوگ کیوں بور ہوں۔ چلو ہم لوگ ذرا چوپاٹی گھوم آتے ہیں گاڑی تھی ہی آدھ پون گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ امّی چاہتی تو نہیں مگر انہیں انکار کرتے نہ بنا۔ امّی، آپا اور شہلا ان کے ساتھ چوپاٹی چلی گئیں۔ جاوید بھائی اور میں نے سوچا بھی کہ صفدر صاحب آخر اس قدر مہربان کیوں ہیں۔ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ دو چار دن بعد پھر انہوں نے خواہش ظاہر کی۔ اب کے امّی نے منع کر دیا شہلا کا بھی موڈ نہ تھا۔ مگر سب کے اصرار پر وہ آپا کے ساتھ چلی گئی۔ اس طرح اسکرپٹ تیار ہونے سے پہلے کئی بار صفدر بھائی امّی، آپا اور شہلا کو بغرض تفریح لے گئے۔ ان کے مزاج کی تھاہ پانا آسان نہ تھا۔ اس لئے اپنی اپنی جگہ پر سب ہی چوکنا تھے۔ صفدر صاحب بھی اتنی آہستگی سے قدم بڑھا رہے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اسکرپٹ میں دیر ہوتی گئی مگر صفدر صاحب نے کسی اتاولے پن کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹے کئی بار کہا کہ تھوڑی بہت تاخیر ہو تو برا نہیں مگر کام اچھا ہونا چاہئے۔ ایک بار فلم شروع ہو جائے پھر رخنے نہیں آنے چاہئیں۔ جاوید بھائی کا پارٹنر جوش انہیں دیکھ کر ہی بجھ رہا تھا

لہٰذا ذہنی ورزش کی پیشکش ہے۔ اُسے یقین تھا کہ فلم سیٹ پر بن ہی جائے گی۔ اس کے بعد صفدر رہٹ بھی بلاتے تو کوئی بات نہ تھی۔ دوسری پارٹیاں بھی پکڑی جا سکتی تھیں۔ وہ روزانہ ہی باقاعدگی سے آتا، گرم جوشی سے بحث میں حصہ لیتا۔ جاوید بھائی نے اپنی کہانی پاکستانی ڈائجسٹوں میں چھپنے والی انگریزی کہانیوں کے ترجموں اور ناولوں کی تلخیصوں سے بنائی تھی۔ جوشی کو پتہ تھا کہ اس میں سے کون سے مناظر، واقعات اور کردار دوسری فلموں میں معمولی ردو بدل سے آچکے ہیں۔ بیسٹ سیلر ناولوں کا اس کا بڑا عمدہ مطالعہ تھا۔ وہ جب بھی آتا ایک آدھ موٹا سا پیپر بیک ناول ہاتھ میں ہوتا۔ جاوید بھائی یہ جان کر پژمردہ ہو جاتے کہ ان کی کہانی کا کوئی کردار سچویشن یا سین کسی اور فلم میں آچکا ہے۔ اس کے بدلے وہ کسی بالکل نئے ناول سے مطلوبہ چیز نکال لاتا اور جاوید بھائی اسے معمولی چیلا و حجت کے بعد قبول کر لیتے... فلمیں بھی اس نے بہت دیکھی ہوئی تھیں۔ ہتلا کو بھی۔ اس کے ساتھ گفتگو میں لطف آتا تھا۔ مگر ساتھ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اب ویسا شوق نہیں رہا۔ ممکن ہو ہماری ساری محنت اُسے خیالی منصوبے سے زیادہ نہ لگتی ہو۔ صفدر لغمانی پر اُسے بالکل بھی بھروسہ نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی وجہ نہیں جو فلم نہ بن سکے۔ بہت سی فلمیں اس سے دشوار حالات میں بنی تھیں۔ ایک روز امی نے بھی پوچھا کہ منے تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ فلم بنے گی بھی یا بس باتیں ہی باتیں ہیں گیا۔

"بننے کی ہوس نہیں؟" میں نے امّی سے کہا
"بیٹی، جس کے پاس بھی فالتو پیسہ آ جاتا ہے اُسے فلم بنانے کی سوجھتی ہے۔ صفدر بھائی کے پاس بھی دو نمبر کا پیسہ کافی ہے۔ چار پانچ لاکھ خرچ بھی ہو گئے تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔"

"تجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" امّی نے پوچھا۔

"کم از کم شہلا اپنا کیریئر شروع کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "آج انڈسٹری کے کامیاب اداکار، ہدایت کار بھی اپنے لڑکے لڑکیوں کے لئے پہلے خود فلم بناتے ہیں۔ شہلا تو خوش قسمت ہے کہ اس کے لئے صفدر پیسہ لگا رہے ہیں۔"

"ارے خاک ڈال اس پر۔" امّی نے کہا۔ "وہ فلم اسٹار نہ بھی بنی تو کیا فرق پڑے گا۔ اور اُسے تو اب ویسے بھی فلموں میں دلچسپی نہیں رہی۔ یہ صفدر سے بھی مجھے ہول آ رہے ہے۔ پتہ نہیں کیا گل کھلا دے۔ بے مقصد تو وہ ایک پیسہ بھی اپنی انٹی سے ڈھیلا نہ کرنے کا۔ آج تک تو میں یہی دیکھتی آئی ہوں۔"

"ہوا کرے۔" میں نے کہا۔ "اس میں اپنا کیا جا رہا ہے۔ رہا مقصد تو آج نہیں تو کل معلوم ہو ہی جائے گا۔"

میرے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جب فلم بنتی ہے تو بے تحاشہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ پروڈکشن انچارج تو میں ہی رہوں گا۔ صفدر صاحب خود بھی کہہ چکے تھے۔ کہ میرا تو بس نام ہوگا۔ باقی جو کچھ خرچ ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک آدھ لاکھ تو میں بچا ہی لوں گا۔ اور ایک بار تجربہ ہو جائے تو پھر فلم

بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک اسکرپٹ کا ہی ذرا ٹیڑھا کام تھا۔ تو جوشی کو لینے سے وہ پرابلم تو حل ہو گیا۔ اور ویسے بھی لکھنے والوں کی کیا کمی ہے؟

بائیس

خدا خدا کر کے اسکرپٹ مکمل ہوئی۔ اس دوران میں موہن کمار کے پاس برابر جاتا رہا۔ شہلا کے متعلق اُس نے مجھ سے خود ہی دوبارہ نہیں پوچھا۔ گھر پر آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میرے ساتھ بھی اس کا رویہ سرد ہو گیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ فلمی ماحول کا اثر تھا یا جانے کیا کہ جن باتوں پر پہلے میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ اب معمولی معلوم ہونے لگیں۔ خود غرضیاں، نفسا نفسی، قریب ترین شخص کو اپنے مفاد کے لئے تباہ کر دینا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے تھا اور اس طرح جیسے روزمرہ کی بات ہو۔ رفتہ رفتہ میں بھی یہی سوچنے لگا کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ایک بار یہی ذکر جاوید بھائی اور جوشی کے سامنے چھڑ گیا جاوید بھائی نے کہا "یار، اس معاملے میں میرے خیالات مختلف ہیں۔ میں ذرا پروگریسو ذہن کا آدمی ہوں۔ ہماری جو اقدار ہیں وہ موجودہ زمانے کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مارکس کا کہنا ہے ہر دور میں لوگ

کا استحصال ہوتا آیا ہے۔ جاگیرداری عہد میں عورت بھی اور چیزوں کی طرح مرد کی جائیداد کا ایک حصّہ مانی جاتی تھی۔ جبکہ بحیثیت انسان اسے اپنے طور پر پوری آزادی ہونی چاہئے۔ عورت اگر اپنی مرضی سے مرد کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہتی ہے تو اسے اُس کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مارکس نے واقعی کہیں یہ لکھا تھا یا نہیں۔ شاید جاوید بھائی نے بھی کہیں سے سن لیا تھا۔ اور اُسے توڑ مروڑ کر بیان کر رہے تھے کیونکہ سنجیدہ کتابیں پڑھنا نہ اُن کے بس کا روگ تھا نہ میرے۔ مگر جاوید بھائی کی بات میرے دل کو لگی۔ آخر ہم پچھڑے ہوئے لوگ ہیں۔ ہر بات میں مغرب کے دست نگر امریکہ کے مقبول عام ناولوں میں بھی جس طرح جنس کا، انسانی رشتوں کا ذکر آتا تھا مجھے لگتا تھا کہ وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔ ان کی تہذیب ہم سے پچاس برس آگے تھی۔ اُس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ جاوید بھائی نے نہ تو شادی کی تھی، نہ ہی ان کے کوئی بہن تھی، ان کے خیالات محض کتابوں سے مستعار رکھتے -- یہ خیالات ہماری ثقافتی اقدار سے کہاں تک ہم آہنگ تھے؟ یہ ہم نے نہیں سوچا کر نفسانی اغراض کے کھونٹے سے بندھے ہم اپنے چھوٹے سے مادی دائرے ہی میں گھوم رہے تھے۔ اور اُس میں مست تھے۔

ایک دن موہن سے مل کر میں لوٹ رہا تھا کہ شانتا کے والد مجھے ملے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی کار روکی، گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے وہ بڑی گرمجوشی سے مجھے نزدیک کے اُڈپی ہوٹل میں

لے گئے۔ اُن سے گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ کسی کے کہنے پر درشن رائے سے بھی وہ جا کر ملے تھے اور اُس نے ایک فلم میں شانتا کو رقاصہ کا رول دیا ہے۔

"کیا آپ مطمئن ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بریک ملنا اہم بات ہے مسٹر سعید" چندر کانت نے کہا۔ درشن رائے نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شانتا کا چہرہ ہیروئن کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ہاں رقاصہ کا رول دے سکتے ہیں، ہر فلم میں دو تین رقص تو ہوتے ہی ہیں۔ ممکن ہے اُسے سائیڈ ہیروئین کا بھی موقع ملے۔

اُس وقت مجھے شہلا پر سچ مچ غصہ آیا۔ شہلا چاہتی تو اس وقت ہیروئن بن چکی ہوتی۔

عکس برابر نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں۔ میرا اعمال نامہ جیسے میرے ہی سامنے رکھ دیا گیا ہے اور اس میں سوائے غلطیوں اور غلطیوں کے اور ہے ہی کیا؟ مگر میں اسے آخر تک دیکھنا چاہتا ہوں۔ یاد کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے بعد بھلے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں۔

فلم کا اعلان ٹریڈ گائڈ میں آ گیا۔ ہم نے مہورت کا بھی بندوبست کر دیا۔ ایک روز صفدر صاحب دوپہر میں آئے۔ ہمیں تعجب ہوا، مگر انہوں نے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مہورت کے لئے شہلا کو ایک اچھی سی ساڑی دلوا دیں۔

"اس کی کیا ضرورت ہے" امّی نے کہا "اس کے پاس تو کئی

اچھی ساڑیاں ہیں۔"

"خالہ بی، آپ نہیں سمجھتیں ان باتوں کو" صفدر صاحب نے کہا۔ "کم از کم سات آٹھ سو روپے کی ساڑی تو مہورت کے لئے ہونی ہی چاہیئے۔"

مجھے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوئی۔

آپا شہلا کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوئیں کہ صفدر صاحب زبردستی انہیں اُسے بھی کچھ خریدوا نہ دیں۔ اس لئے امی نے مجھ سے کہا۔

"ارے بھئی میں کوئی غیر ہوں" صفدر صاحب بولے "خالہ آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔"

آخر فاصلہ کس حد ہی کیا۔ شہلا درشن رائے کے آفس پر موہن کمار کے گھر جا رہی تھی۔ صفدر صاحب کے ساتھ جانے کو کیسے منع کرتی اور بہر حال وہ رشتہ دار تھے۔

"ارے، تمہیں کچھ نہیں لینا تو ساتھ چلے چلو" صفدر صاحب نے مجھ سے کہا۔

"نہیں مجھ کو کچھ نہیں خریدنا" میں نے چوٹ کھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سمجھا جائے کہ اس طرح میں بھی صفدر صاحب سے کچھ وصول رہا ہوں۔ شہلا بھی تذبذب میں تھی۔ جاتو وہ بھی نہیں چاہتی تھی مگر مہورت تو بہر حال شاندار ہونی چاہیئے تھی۔

شہلا اور صفدر صاحب تو چلے گئے۔ گھر میں ناگوار سی

خاموشی پھیل گئی۔ عرفان نے میرے لئے سنبھالا۔ میں ریکارڈ پلیئر پر انگریزی دھنیں سننے لگا۔ چار بجے کے قریب جاوید بھائی اور جوشی آئے تو ماحول بدلا۔ ساڑھے پانچ بجے تک صفدر صاحب اور شہلا واپس آ گئے۔ صفدر صاحب نے شہلا کو دو بھاری ساڑیاں دلوائی تھیں۔ مجھے بھی انہوں نے سفاری کا ایک سوٹ پیس دیا۔ اگرچہ میں نے کہا بھی کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔

"نارائن کے پاس سلوا لینا۔" انہوں نے کہا "اس سے کہنا بل میرے نام سے بنا دے۔"

نارائن شہر کا مشہور ٹیلر تھا۔ سوٹ پیس دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ پھر نارائن کا نام سن کر جو کچھ بھی احساسات میرے ذہن میں تھے یک لخت غوطہ لگا گئے۔

اگلے روز صفدر صاحب پھر آئے۔ انہوں نے کہا نئی سینڈلیں بھی تو خریدنی ہیں۔ پھر زیورات کا سلسلہ چلا۔ اس طرح کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ صفدر صاحب کو سمجھنا مشکل تھا کیا ہو رہا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہرحال پانچ روز قبل صفدر صاحب آئے انہوں نے کہا:

"یہ مہورت ہفتہ دس روز کے لئے ملتوی نہیں ہو سکتی ہے؟"

"کیوں؟" ہم نے پوچھا۔

"بھئی ہم لوگ بھی کتنے خود غرض ہیں۔ اپنے کاموں میں ہمیں یاد ہی نہ رہا کہ اسی روز پھوپھو شہلا کے والد کی برسی بھی تو ہے۔"

ہم لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ بات تو سچ تھی۔

"وہ تو بزرگ خالہ نے یاد دلایا" صفدر صاحب نے کہا۔ "ورنہ مجھے بھی خیال نہ تھا۔"

"صورت تو ملتوی کرنی ہی پڑے گی۔" شہلا نے امی سے کہا۔

"شام میں کھانا پکوا لیں گے۔" امی نے کہا "فاتحہ تو شام میں بھی دے سکتے ہیں۔ مہورت ملتوی کروانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں امی۔" شہلا نے کہا "مزا نہیں آئے گا۔ یہ خیال رہے گا کہ ہم لوگ بہت غلط کام کر رہے ہیں۔"

"تم سمجھتے نہیں ہو یار۔" جوشی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ "یہ تاریخ میں نے مشہور جیوتش دامن سے گرگام میں خود اس کے گھر جا کر لی تھی۔ سب بڑے بڑے پروڈیوسر اُسی سے مہورت نکلواتے ہیں۔"

"اب تم لوگ جو فیصلہ کرو۔" صفدر صاحب نے بڑے منکسرانہ لہجے میں کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بہرحال خرچ تو میں کر ہی رہا ہوں۔ تھوڑا سا نقصان اور سہی۔

مہورت بہرحال دس پندرہ دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔ شہلا کے ساتھ جس اداکار کو ہم سائن کر رہے تھے اس کی ابھی دو ایک فلمیں ہٹ ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اُسے دو تین فلمیں اور مل گئی تھیں مگر ہم سے وہ کسی سُپر سٹار کی طرح بات کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ شہلا کے بجائے کسی مشہور ہیروئن کو لیا جائے تاکہ پکچر (ب) گریڈ سے اے گریڈ میں آ جائے۔ اور ہم تو لے بھی لیتے مگر صفدر صاحب تو محض شہلا کی خاطر فنانس کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے جس دن ہم نے

مہورت ملتے کی تھی وہ کسی بڑے ڈائرکٹر کی فلم کی شوٹنگ کے لئے کشمیر جارہا تھا۔ جاتو وہ دوپہر کو رہا تھا مگر ہم نے اسی بہانے مہورت ملتوی کردی۔ اگلی تاریخ تو اس کی واپسی کے بعد ہی طے ہوسکتی تھی۔

بہرحال ہم لوگ گرم جوشی سے فلم پر کام کرتے رہے اداکاروں کا انتخاب مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ پورا کیا۔ اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ شہلا صفدر سے کچھ زیادہ ہی بیزار نظر آتی ہے۔ آپا بھی اُن دنوں اپنے کمرے سے نکلتی نہیں تھیں۔

"یہ صفدر صاحب روز کیوں آجاتے ہیں" شہلا نے جھلا کر ایک دن مجھ سے کہا۔

"مجھے اُن کے ساتھ باہر جانا بالکل پسند نہیں" شہلا نے کہا۔ "ٹھیک ہے وہ فلم بنا رہے ہیں۔ مگر مجھ پر کیوں عذاب بنتے ہیں، انہیں کب تک برداشت کروں۔"

"تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟" مجھے بھی غصہ آگیا، "وہ تمہارے اسی رویے کی وجہ سے تمہیں چانس نہیں ملتا۔"

شہلا حیرت سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ یقین نہیں آیا کہ یہ جملے میرے ہوں گے۔ میری زبان سے یہ جملے نکل تو گئے مگر میری حالت چوروں جیسی ہو گئی۔ جیسے دل کی بات زبان پر آگئی ہو۔

اگر شہلا کچھ کہہ بیٹھتی تو پتہ نہیں میرا کیا حال ہوتا مگر وہ کچھ ایسی گُنگ ہوئی کہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اُس شام صفدر صاحب آئے تو وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے چلی

گئی۔

اس کے اگلے روز بھی یہی ہوا۔ صفدر صاحب کچھ کبیدہ خاطر نظر آئے۔ اس سے اگلے روز میری شہلا سے پھر تکرار ہوگئی۔ امی نے بھی شہلا کو ڈانٹا۔ اس کے بعد صفدر صاحب دو تین دن نہیں آئے۔ چوتھے روز آئے تو شہلا کو دیکھ کر خوش ہوگئے۔ دو تین گھنٹے ہم لوگ غپ شپ کرتے رہے۔ دو تین روز تک پھر یہی سلسلہ رہا۔ شہلا کا موڈ بھی تب تک بحال ہوگیا۔ اُسے دراصل صفدر صاحب کے ساتھ اکیلے جانا بھاری پڑ رہا تھا۔ پھر ایک اتوار ہم سب مل کر چوپاٹی گئے۔

اس کے بعد ایک دن پھر صفدر صاحب کو کچھ خیال آیا۔ "ذرا قیصر دلہن کے لئے کچھ تحفے خریدنے تھے۔" انہوں نے امی سے کہا۔

قیصر دلہن ان کی بڑی بہن کا نام تھا۔

پھر شہلا کی طرف دیکھنے لگے۔

"شہلا تم ساتھ چلو" انہوں نے بڑی خوش مزاجی سے کہا "آج ہم اسی لئے آئے ہیں"

پھر انہوں نے سب سے تخاطب کیا۔

"وہ بھی شہلا کی پسند کا جواب ہوتی ہے"

شہلا نے شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر امی کو اور بڑے سرد لہجے میں صفدر صاحب سے کہا "آپ چائے پیجئے میں ابھی آئی"

میں خود شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ مگر میں دل ہی دل میں اپنی خاموشی کی تاویلیں کر رہا تھا۔

صفدر بھائی نے جاتے جاتے سو کا نوٹ میری جیب میں ڈال دیا
"اس کی کیا ضرورت ہے" میں نے کہا۔
"رکھو منے میاں، آخر ہمارا بھی تو تم پر کچھ حق ہے یا نہیں"
میں اور خفیف ہو گیا۔ اس وقت میری حالت کٹکھنے کتے جیسی تھی۔ پتہ نہیں میں کس بات پر جاوید بھائی پر برس پڑا۔ جاوید بھائی بیچارے چپ چاپ سنتے رہے۔ جوشی خاموش بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہا۔

تیئیس

صفدر صاحب اور شہلا ابھی گئے ہی تھے کہ شنو خالہ آن ٹپکیں۔ تھیں تو وہ امی کی خالہ زاد بہن مگر امی میں ان میں بڑا تضاد تھا۔
"بڑے دنوں میں آئیں اب کے" امی نے ——— "میں خود سوچ رہی تھی آنے کے لیے"
"تم کیوں آنے لگیں" شنو خالہ اپنے مخصوص شیطانی لہجے میں بولیں "تم سب بڑے لوگ ہو گئے ہو۔ ڈر لگتا ہے، پتہ نہیں پہچانو بھی یا نہیں"
"اے یہ کیسی باتیں کرتی ہو" امی نے کہا۔ "بھلا پہچانیں گے کیوں نہیں؟"
"اور نہیں تو کیا" شنو خالہ نے کہا "جب آدمی بڑا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنے عزیزوں کو ہی بھلا دیتا ہے۔ میں نے کہا اس سے پہلے

کہ تم پالی ہل پر پہنچو میں مل تو آؤں۔ پتہ نہیں پھر ملاقات ہو نہ ہو!"

"آج تو تم بڑے اچھے موڈ میں نظر آ رہی ہو" امی نے کہا "ایک تو اتنے دن بعد آئیں اور آتے ہی رنگ میں آگئیں خیر تو ہے!"

"اور بیٹا سنا تم بھی پروڈیوسر ہو گئے ہو" شنو خالہ مجھ سے بولیں، "مبارک ہو۔ بیٹا جگ جگ جیو۔ مجن خالہ کے لڑکے شمیم نے دیکھا تھا۔ تمہیں اور شہلا کو کسی فلم ڈائریکٹر کی گاڑی میں!"

میں خاموش اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ اور کرتا بھی کیا۔ امی نے پان بنا کر شنو خالہ کو دیا۔ پان منہ میں رکھتے ہی انہیں شہلا یاد آگئی۔

"اے شہلا کہاں ہے، نظر نہیں آئی۔ کسی پروڈیوسر سے ملنے گئی ہے کیا؟"

"نہیں، وہ صفدر آئے تھے۔ اُن کے ساتھ گئی ہے۔" امی نے دبی زبان سے کہا۔

"صفدر کے ساتھ؟ کیوں کھلا؟" بڑا معصوم سا چہرہ بنا کر انہوں نے پوچھا۔

"قیصر دلہن کے لئے انہیں کچھ گہنے لینے تھے" امی کی آواز اور بھی دھیمی ہو گئی۔ ان کے لہجے میں لرزش تھی۔

"اکیلے بھیج دیا صفدر کے ساتھ" شنو خالہ بولیں۔ "بھئی تم لوگوں کا بھی کلیجہ ہے۔ جان جوان لڑکیوں کو اس طرح دن دہاڑے بھیج دیتی ہو کسی کے ساتھ۔ اور تم بھی کیا کرو گی بہن۔ بچوں کے آگے تمہاری چلے گی بھی کیا۔ نیا زمانہ ہے نئے رنگ ہیں۔"

"اے تو کیا صفدر کوئی غیر ہیں" امی نے مدافعت کی کوشش کی۔

"بھئی ہمارے خاندان میں تو ہم نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا کہ اس طرح جوان جوان لڑکی دن دہاڑے غیر مرد کے ساتھ گھر سے باہر جائے۔ شہلا کے ابا ہوتے تو کیا اپنی لڑکی کو ایسے چھوڑ دیتے؟ پتہ نہیں تمہاری عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں۔ بچوں کی محبت میں کوئی اس طرح پگھلا تو نہیں جاتا۔ پتہ ہے تمہیں لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" امّی کے کان کھڑے ہوئے۔ میں بھی چوکنّا ہو گیا۔

"ابھی کل ہی جاوید کی ماں آئی تھیں، کہہ رہی تھیں کہ آج کل صفدر روزانہ شہلا کو سیر کرانے لے جاتے ہیں، بچے کئی بار دیکھ چکے ہیں۔"

امّی کا چہرہ سپید ہو گیا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ شاید شنّو خالہ کو بھی محسوس ہو گیا کچھ دھیمی پڑیں۔

"میں نے تو جاوید کی اماں سے صاف کہہ دیا" وہ بولیں "بی تم کچھ بھی کہو۔ شہلا ہے بہت اچھی لڑکی اور میں تو کہوں کہ اگر صفدر سے اس کی شادی ہو بھی جائے تو کیا بُرا ہے۔ صفدر کے پاس خدا کے فضل سے کسی چیز کی کمی ہے۔ سکھ چین سے تو رہے گی۔"

امّی کو اور مجھے تو کاٹو تو خون نہ نکلے۔ مگر شنّو خالہ کے آگے کس کی زبان چلتی! بس شہلا کو پتہ نہ چلے تو خیر ہو۔

شنّو خالہ تو سنا سنو کر چلی گئیں گھر میں سب کا موڈ خراب ہو گیا۔ سات بجے کے قریب صفدر بھائی آئے تو امّی نے ان سے کہا وہ ساری باتیں مسکراتے ہوئے سنتے رہے پھر بولے "خالہ جی آپ کس کس کا منہ بند کرتی پھریے گا۔ اور شنّو خالہ تو کہیں گی ہی۔"

"کیوں ؟" امی نے پوچھا۔

"انہوں نے خود اپنی بیٹی کے لئے کہلوایا تھا۔" صفدر بھائی بولے۔

کبھن خالہ خود آئی تھیں پیغام لے کر کہ قیصر دلہن تو سدا ہی بیمار رہتی ہیں۔ میں اُن کی بیٹی کو بیاہ کر لے آؤں۔"

"تو اُس میں کیا بُرائی ہے۔" امی نے کہا "وہ تو بڑی اچھی ہے۔ خوبصورت اور سُگھڑ بھی۔"

"ہاں وہ تو ہے مگر اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو آپ کے سامنے نہیں کہہ سکتا پھر میری مرضی۔ میں نہیں چاہتا بس۔ شادی تو مرضی سے ہی ہوتی ہے۔"

"ایسی باتیں کون سی ہیں بھلا ؟"

"اب جانے بھی دیجیے۔" صفدر صاحب نے کہا۔ "آپ تو دن بھر گھر میں رہتی ہیں، کہیں آنا جانا نہیں۔ آپ کو کیا معلوم دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔؟"

"بھئی میں نے تو اُس میں بُرائی نہ دیکھی۔" امی نے کہا۔

"تو بس یہی سمجھ لیجیے کہ میں نہیں کرنا چاہتا۔"

امی نے منہ کھولا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہی تھیں کہ ہماری لڑکی جو بدنام ہو رہی ہے۔ مگر کچھ کہا نہیں۔

"میں کیا کسی کی پرواہ کرتا ہوں" صفدر بھائی بے نیازی سے بولے۔ "اگر کسی دن مجھے غصہ آگیا تو۔"

کہتے کہتے انہوں نے ایک نظر شہلا کو دیکھا اور رُک گئے۔ شاید انہوں نے سوچا کہ ابھی اِس کا وقت نہیں ہے۔

"فلم مکمل ہو جائے" انہوں نے کہا "پھر دیکھا جائے گا۔"

شنّو خالہ کی لڑکی فوزیہ کا ذکر کر کے صفدر بھائی نے میری دکھتی نبض پر انگلی رکھ دی تھی۔ سب ہی جان گئے تھے کہ فوزیہ میں مجھے کس قدر دلچسپی ہے۔ فوزیہ کے رویے سے بھی کبھی ناپسندی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ اُس کی خاموشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ خود شنّو خالہ کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ مگر وہ دنیادار قسم کی جاہل عورت تھیں۔ اُن کی دنیا چولہے چکی تک محدود تھی۔ ان کے نزدیک صفدر صاحب کی جو اہمیت تھی وہ بھلا میری کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو بس ایک ہی بات سوچ سکتی تھیں کہ فوزیہ کسی کھاتے پیتے گھر جائے۔ باقی باتوں سے انہیں سروکار ہی کیا تھا۔

صفدر بھائی کی بات پر مجھے غصّہ تو بہت آیا۔ مگر اُنہوں نے بہت سوچ کر تیر چلایا تھا۔ میں سوچنے لگا سچ تو ہے۔ اگر شہلا کی شادی صفدر سے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ پیسہ ہے، جائداد ہے۔ وہ زندگی بھر عیش کرے گی۔ اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا کہ میں محض اس لئے سوچ رہا ہوں کہ فوزیہ کا حصول میرے لئے آسان ہو جائے۔

-

چوبیس

مہورت کی تاریخیں دوبارہ مقرر ہوئیں۔ جوشی اور جاوید

بھائی نہ صرف اسکرپٹ پر برابر کام کر رہے تھے بلکہ مہورت کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ میں بھی ان کا جہاں تک ہو سکتا ہاتھ بٹاتا۔ صفدر حسبِ معمول روز آتے کوئی کام ہوتا تو جلدی اٹھ جاتے، مگر آتے ضرور۔ جاوید بھائی اور میں کئی چکر لگانے کے بعد ہیرو سے تاریخ لینے میں کامیاب ہوئے۔ مگر پھر فون آیا کہ ہیرو کے جیوتشی نے فلم کی مہورت اس تاریخ کو کرنے سے منع کیا ہے۔ اس نے مہورت پھر دس پندرہ دن آگے بڑھا دی۔ وہ بھی صبر و شکر کر کے ہم نے منظور کر لیا۔ اسٹوڈیو پھر بک کیا گیا۔ کیمرہ مین سے رابطہ قائم کیا گیا، صفدر بڑے صبر سے ہماری روزانہ پروگریس سنتے۔ ٹریڈ گائڈ میں، اخباروں میں، رسالوں میں فلم کی مہورت کی خبریں آگئیں۔ صفدر کا نام بطور پروڈیوسر چھپا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پورے کنبے میں، اس علاقے میں جہاں وہ رہتے تھے یہ خبر پھیل گئی۔ جاوید بھائی بے چارے سب سے زیادہ مصروف تھے۔ دن بھر ادھر ادھر دوڑتے رہتے۔ شام میں جوتشی کے ساتھ اسکرپٹ پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ اور رات گئے تک صفدر بھائی اور ہم لوگوں کے ساتھ گپ شپ۔ صفدر کا رویہ بھی ان کے ساتھ بہت مشفقانہ ہو گیا تھا۔ ہر روز پوچھتے کہ کچھ خرچی کی ضرورت ہو تو ہم سے لو۔ تیسرے چوتھے دن میری اور جاوید بھائی کی جیب میں سو پچاس ڈال ہی دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس صفدر کے چرچے کنبے بھر میں پھیلے ہوئے تھے وہ کوئی اور ہی صفدر تھا۔ رئیس ہو کر بھی اس قدر خلیق، متواضع اور شفیق۔ ایک بار جوشی نے مجھ سے کہا بھی کہ یار تم لوگ پتہ نہیں کیوں

ان کے متعلق اس قدر بدگمان نہ ہو۔ اتنا ملنسار آدمی تو پیسے والوں میں میں نے دیکھا ہی نہیں۔

"ہو سکتا ہے تمہاری بات سچ ہو!" میں نے کہا "شاید ہم لوگ غلط سنتے رہے ہیں۔ دولت مندوں کے متعلق ایسی باتیں تو لوگ اُڑا ہی دیتے ہیں۔"

"ابھی کل ہی کی بات لے لو۔" جوشی نے کہا "انہوں نے مجھ سے پوچھا کہاں رہتے ہو۔ میں نے کہا سی پی ٹینک، بولے آؤ تمہیں چھوڑ دوں۔ میں نے کہا بھی کہ آپ کو بہت گھوم کر نکلنا پڑے گا۔ مگر نہیں مانے۔ بولے یار اس میں فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ دس پندرہ منٹ کی تو بات ہے!"

"پھر بھی پتہ نہیں کیوں ان سے خوف محسوس ہوتا ہے!" میں نے کہا۔

"ہاں چہرے سے بہت چالاکی ٹپکتی ہے" جوشی نے کہا "مگر چہرے دھوکہ بھی تو دیتے ہیں!"

"تم صحیح کہتے ہو" میں نے کہا۔

سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب بس فلم کے کسی شارٹ پر مہورت کرنی تھی۔ رات کے کھانے پر ہم اسی پر غور کر رہے تھے کہ کس شارٹ پر مہورت کریں۔ مہورت شارٹ شہلا اور ہیرو پر لیا جانا تھا۔ جوشی نے ایک لکھا ہوا شارٹ شہلا کو دیا۔ شہلا نے کچھ دیر اسے بغور دیکھا پھر جوشی کے ہاتھ میں واپس دے دیا۔ پھر اپنی ہتھیلیاں مسلتے

ہوئے لب کھولے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر رک گئی۔

ہم لوگ اُسے تعجب سے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" جاوید بھائی نے کہا۔ "تمہارے ذہن میں کوئی شارٹ ہے کیا۔؟"

"نہیں" شہلا نے بدستور ہتھیلیاں مسلتے ہوئے کہا۔ "پھر خلا میں دیکھتی ہوئی بولی "دراصل میں نے طے کر لیا ہے کہ میں فلم میں کام نہیں کروں گی۔"

"کیا؟" جاوید اور جوشی یک بیک اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں، میں فلم میں کام نہیں کروں گی۔؟"

وہ اُٹھی اور سیدھے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

"لیکن کیوں؟" میں نے اپنے حواس میں آتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل میں نے بہت سوچا، مگر اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"لیکن پرسوں مہورت ہے شہلا" میں نے کہا "سب انتظام ہو چکا ہے۔ اور تم اب کہہ رہی ہو۔ اب ہم ملتوی نہیں کر سکتے۔ اس فلم میں تو تمہیں کام کرنا ہی ہوگا۔"

نہیں منے بھائی" وہ بڑے اطمینان سے بولی "میں فیصلہ کر چکی ہوں یہ لائن مجھے راس نہیں آئے گی۔"

جاوید بھائی، جوشی، امّی، آپا سب ہی حیران پریشان شہلا کا منہ تکنے لگے۔ صرف صفدر اطمینان سے پان چبا رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ہلکی ہلکی سی خوشی اُن کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی اور چہرے پر ہلکا سا جیتا نہ تبسّم۔

کہیں یہ صفدر کی شرارت تو نہیں۔ میں نے سوچا مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ صفدر کی مہربانیوں کے گھیرے سے نکلنے کے لیئے ہی شہلا نے یہ اقدام کیا ہو۔

"شہلا" میں نے کہا "صفدر بھائی پہلے ہی اتنا خرچ کر چکے ہیں"۔

"نہیں، نہیں" صفدر بھائی ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے۔ "اس کی کوئی بات نہیں۔ پیسے کی ہمیں پرواہ نہیں۔ ہم تو شہلا کی خوشی کے لیئے فلم بنا رہے تھے۔ ورنہ ہمیں فلم سے کیا لینا دینا۔ اگر شہلا فلم میں کام کرے گی تو ہم ضرور فلم بنائیں گے۔ بھلے ہی دس لاکھ لگ جائیں"۔

"صفدر بھائی لیکن ہم پورا انتظام کر چکے ہیں" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"اب تو صرف فلم شوٹ کرنی ہے"۔

"تو ہم کب انکار کر رہے ہیں" صفدر بھائی نے کہا۔

"تو ہم شہلا کے بجائے کسی اور کو لے لیتے ہیں" میں نے کہا۔

شہلا نے اطمینان کا سانس لیا۔ مڑ کر مجھے شکر گزار نگاہوں سے دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"خالہ بی ذرا ایک اور پان بنا دیں ہم کو" صفدر نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اور منّے میاں تم ایک بات سمجھ لو" وہ بولے۔

"ہم تو صرف تم لوگوں کے لیئے فلم میں سرمایہ لگا رہے تھے ہم نے پہلے ہی کہا تھا۔ اب شہلا نے خود انکار کر دیا۔ اب تباؤ ہم کیا کریں؟"

ایک لمحے کو وہ رُکے پھر میری اور جاوید بھائی کی طرف بڑی مشفقانہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر گویا ہوئے۔

"جاوید ہم اب بھی تیار ہیں فلم بنانے کے لئے۔"

ہماری آنکھوں میں بجھے دیئے ایک بار پھر لو دے اٹھے۔

"تو آپ بنائیں گے فلم"؟ جوشی نے کہا۔

"بالکل بنائیں گے۔" صفدر بھائی نے گلوری امّی کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

"مگر—"

"یہ کہہ کر انہوں نے پان منہ میں رکھا اور ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ اگر اس میں منّے کا اور جاوید کا کوئی فائدہ ہو۔ بس اسی صورت میں ہم آج بھی پیسہ لگانے کو تیار ہیں۔"

"ہمارا فائدہ تو ہے"، میں نے کہا۔ "ہمیں انڈسٹری میں قدم جمانے کا موقع مل جائیگا۔"

"بھئی ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا۔" صفدر بھائی بولے۔ "منّے میاں آخر کیا کریں گے؟"

اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ میرا تو پورے پروڈکشن میں کہیں نام ہی نہ تھا۔ میں نے خود بطور اسسٹنٹ پروڈیوسر اپنا نام دے دیا تھا۔ امّی کو بھی ان کی یہ بات بڑی لگی۔ مگر وہ کچھ بولیں نہیں۔

"منّے میاں اسسٹنٹ پروڈیوسر ہیں مگر لوگوں کو تو پتہ ہے کہ سرمایہ میں لگا رہا ہوں۔ جسے بھی فلم بنانا ہوگا۔ وہ بہرحال میرے ہی پاس

آئے گا۔ مُنّے کے پاس تو جانے سے رہا۔"

امّی کا چہرہ اتر گیا اور میرا بھی۔

"ایک بار پھر فلم تو شروع ہو جانے دیجئے پھر دیکھئے مُنّے بھائی کو کہیں نہ کہیں جوہر دکھانے کا موقع مل جائے گا۔" جاوید بھائی نے کہا "کہانی اور اسکرپٹ پر تو انہوں نے ہمارے ساتھ کام کیا ہی ہے۔"

"تم چپ رہو جی" صفدر نے جاوید بھائی کو ڈانٹا "ہمیں معلوم ہے تم کیوں کہہ رہے ہو۔" پھر امّی سے مخاطب ہوئے۔

"خالہ جی! ہمارا لاکھوں کا کاروبار ہے چھ بیکریاں ہیں ہماری، دکانیں الگ۔ آج سینکڑوں ملازم ہمارے ہاتھ کے نیچے کام کر رہے ہیں۔ یہ اتنا بڑا کاروبار کچھ یونہی نہیں کھڑا ہو گیا۔" پھر جاوید بھائی کو گھورتے ہوئے بولے۔ "میاں ہم لونڈے نہیں ہیں تمہاری طرح۔ کسی کاروبار میں ہم بے سمجھے بوجھے ہاتھ نہیں ڈالتے۔ ہمیں معلوم ہے ہم کیا کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اوّل تو تم لوگ فلم بنا نہیں پاؤ گے اور اگر بنا بھی لیا تو تمہارا دماغ کتنا، تجربہ کتنا، کوئی فلم خریدنے کو تیار نہیں ہو گا۔ ریلیز بھی ہم کو ہی کرنا ہو گا اور فلم ہفتے دو ہفتے میں ناکام ہو کر بھبڑ سے اتر جائے گی۔"

ہمیں سانپ سونگھ گیا۔ صفدر پورے فارم میں تھے اور ان کی بات کو جھٹلانا آسان نہ تھا۔

"مُنّے میاں ایک بات سمجھ لو۔" انھوں نے بڑے جلال میں مجھ سے فرمایا۔ "دیکھو اس فلم ولم میں کچھ نہیں دھرا۔ اس میں خواہ مخواہ اپنی زندگی ضائع مت کرو۔ ہمیں ایک منیجر کی ضرورت ہے اور تم پڑھے لکھے ہو۔ خالہ جی آپ

انہیں میرے پاس بھیج دیجئے۔ آگے میں دیکھ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جوشی اُنہیں حیرت سے تک رہا تھا۔

"منّے تم میرے ساتھ آؤ۔"

سیڑھیوں پر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُترتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا: "منّے میاں یقین کرو میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تمہارے بھلے کو کر رہا ہوں۔ اس فلم نگری میں چمک دمک تو بہت ہے مگر اس میں ہاتھ کچھ نہیں آنے کا۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ ہمارے خاندان میں سے کسی کی زندگی اس طرح برباد ہو۔ آج جب ہم آ رہے تھے تمہاری طرف تو ہم نے سوچا کہ ہم بھی کسی حماقت میں گرفتار ہیں۔ خواہ مخواہ تم اپنی زندگی کیوں برباد کرو۔ تمہیں اچھی سی ملازمت چاہئے وہ میں دے دوں گا۔ مجھے خود ایک بھروسے کا مینیجر چاہیئے۔ اپنے ہی خاندان کا آدمی ہو، معتبر ہو اور کیا چاہئے۔ کالج چھوڑے بھی تمہیں کئی سال ہو گئے۔ کیا ملا تمہیں۔ میاں تمہیں شادی کرنا ہے گھر بسانا ہے۔ یا اس بے وقوف جاوید کی طرح اپنی زندگی برباد کرنی ہے۔ بالوں پر برف پڑی تو کوئی لڑکی بھی نہیں دے گا۔"

ہم گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دروازہ کھول کر وہ کھڑے کھڑے بولے۔ "منّے میاں ہمیں معلوم ہے کہ فوزیہ تمہیں پسند ہے۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ میں کشو خالہ سے بات کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ہلکے سے دروازہ بند کیا۔

"تو تم کل آجاؤ۔" انہوں نے گاڑی بڑھاتے ہوئے پھر مجھے تاکید کی۔

واپس آیا تو سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے میت ہو گئی ہو۔

"صفدر بھائی بھی عجیب آدمی ہیں"۔ میں نے کہا۔

"دیکھ لیا نا" جاوید بھائی نے جوشی سے کہا "کہاں لاکر مارا ہے۔ اب معلوم ہوا صفدر کس بلا کا نام ہے۔ مجھے تو پہلے ہی دھڑکا لگا ہوا تھا"

"شہلا مان جائے تو اب بھی بات بن سکتی ہے" جوشی نے کہا۔

"میاں تم صفدر کے حساب سے واقف نہیں ہو۔ کیا مجال جو ذرا بھی غلط ہو جائے۔"

جاوید بھائی نے کہا۔

"یار تم شہلا سے تو بات کر کے دیکھو" جوشی نے مجھ سے کہا۔

"اب تو کل بات ہو سکے گی" میں نے کہا۔

اس رات میں بستر پر لیٹا تو صفدر بھائی کی باتیں صحیح معلوم ہوئیں۔ یہ تو صحیح تھا کہ ہم میں سے کسی کو مکمل تجربہ تھا نہیں۔ فلم بنتی تو سچ مچ اس میں کوئی دم نہ ہوتا۔ اور صفدر کو ہی ریلیز کرنی پڑتی۔ یہ بات بھی صحیح تھی کہ مسلسل بے روزگاری سے میرے اندر ایک طرح کی جھنجھلاہٹ آنے لگی تھی۔ نوزیہ سے شادی کرنے کے لئے مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اس بے مصرف زندگی سے بھی اب الجھن ہونے لگی تھی۔ بظاہر تو صفدر بھائی نے جو منیجری کی آفر دی تھی۔ اس سے بہتر موقع میرے لئے کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔ کسی اچھی کمپنی میں ملازمت ملنا میرے لئے دشوار تھا۔ ایک تو تعلیم مکمل نہیں۔ پھر سفارش کہاں سے لاتا۔ باہر مقابلہ بھی سخت تھا۔ اور اگر ملازمت کرنی ہی تھی تو صفدر بھائی کے ہاں کیا برا تھا۔ میرے مزاج میں بھی آرام طلبی تھی۔ صفدر بھائی کی ہمدردیاں بھی بے مطلب تو

بھیں نہیں۔ وہ ساری تگ و دو شہلا کے لئے کر رہے تھے۔ میں بھی سوچنے لگا آخر اس میں بڑائی کیا ہے؟ شہلا رئیسانہ ٹھاٹ سے رہے گی۔ عمر بھر آرام کرے گی۔ ورنہ آخر شہلا کا بھی کیا مستقبل تھا۔؟ یہ صحیح تھا کہ ابھی اُس کی عمر بہت کم تھی۔ مگر ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ایسی کتنی ہی شادیاں ہوتی ہیں جن میں عمر کا تفاوت بہت ہوتا ہے۔

صفدر بھائی نے بھی کتنی صحیح چال کھیلی تھی۔؟

پچیس

جب سے فلموں کا چکر شروع ہوا تھا۔ شام میں باہر جانے کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ گیارہ بجے تک میں سو جاتا تھا۔ اس لئے خلاف۔ معمول آنکھ جلدی کھل جاتی تھی۔ گھر کے اور افراد تو صبح خیزی کے عادی تھے ہی۔ اسی لئے ناشتہ ہم لوگ ساتھ ہی کرنے لگے تھے۔ اگلے روز ناشتے پر امی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا سوچا ہے؟

"سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں، تنخواہ بھی اچھی رہے گی، اور دوسری سہولتیں رہیں گی۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

امی ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے ہوئے رکیں اور جیسے سوچ میں گم ہو گئیں۔ پھر بولیں۔

"بیٹا میری مرضی تو نہیں ہے۔"

"کیوں؟" میرے گلے میں پھندا لگا۔

منّے تم تو جانتے ہو صفدر کو تمہارے ابّا نے ہی پالا ہے اُس کے پاس کام کرنا میرے دل کو نہیں لگتا۔ تم صفدر کو نہیں جانتے۔ کہ وہ کس قدر طوطا چشم ہے اُسے نظریں پھیرنے پل بھر بھی نہیں لگتا۔" امّی نے کہا۔

رات کا تیر گیا ہوا محل صبح بیٹھ گیا۔ ملازمت کی تو خیر مجھے اتنی فکر نہ تھی مگر فوزیہ صفدر صاحب کہیں کوئی اور چال نہ چل بیٹھیں

"سوچ رہی ہوں شہلا کو بے کر کرشنو کے پاس چلی ہی جاؤں"

"کس لئے ؟" میں نے تجاہل عارفانہ برتا۔

"سوچتی ہوں فوزیہ کو مانگ ہی لوں، کیسی لگتی ہے تمہیں ؟"

"آپ کو پسند ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ؟"

امّی نے مسکرا کر آپا کو دیکھا۔

دونوں ہنس پڑے۔

کیسے انجان بن رہے ہو۔ منّے بھائی، شہلا نے کہا "من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

میں بھی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکا۔

"منّے بھائی بھی اچھی اداکاری کر لیتے ہیں" آپا نے کہا۔

جب سے میں کالج جانے لگا تھا آپا بھی مجھے منّے بھائی ہی کہنے لگی تھیں کہتی تھیں صرف منّا کہنا اب اچھا نہیں لگتا۔

"آپ اداکار بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔" آپا نے کہا۔

"اتنا آسان ہے کیا، کون دے گا کام" میں نے کہا۔

"اسی فلم میں ایک آدھ رول لے لیجئے۔" آپا نے کہا۔

"یہ فلم اب بننے سے رہی۔"

"تم لوگ کسی اور رئیس کو کیوں نہیں پکڑتے" امی نے کہا۔

"اوّل تو کوئی جلدی ملے گا نہیں۔ اور اگر ملا بھی تو جاوید اور جوشی تو پہلے سے ہی ہیں۔ تین تین آدمیوں کو کون جھیلے گا۔"

"امی نئے آدمیوں کو کوئی ویسے ہی پیسے نہیں دیتا۔ فلم بنانے والے بھی زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو کم سے کم پیسوں میں فلم بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کی اپنی یونٹ پہلے سے تیار ہوتی ہے۔"

"وہ تو تین ہی آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں نہین تین آدمیوں کی گنجائش کیسے نکالیں گے۔"

اسی موٹے موہن سے بات کیوں نہیں کرتے" امی نے چائے کا کپ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ویسے ہی ایک ڈیڑھ سال اُس کے پاس ضائع ہوگیا۔ اس کی کوئی فلم بھی سیٹ پر نہیں۔"

"اور وہ جو شہلا کو لے کر فلم بنا رہا تھا۔؟"

"شہلا ہی کب فلموں میں کام کرنے پر راضی ہے؟"

امی چپ ہوگئیں۔ بیٹی کا فلموں میں کام کرنا انہیں کب پسند تھا۔ وہ تو میری خاطر راضی ہوئی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوگیا شہلا، تم نے کیوں فیصلہ بدل دیا۔" میں نے شہلا سے پوچھا۔

"منے بھائی اب تو مجھے ان لوگوں سے گھن آنے لگی ہے۔"

"ہمارا تو بنا بنایا پروگرام چوپٹ کر دیا تم نے۔" میں نے کہا۔

"بس کیا کروں۔ اب تو وہ ماحول ہی مجھے بہت غلیظ معلوم

ہوتا ہے۔"

"ابھی تم ملی ہی کتنے لوگوں سے ہو؟"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب لوگ بُرے ہیں" شہلا نے کہا۔ "مگر ان لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ ہی الگ ہے۔ جو چیز ہمیں بُری لگتی ہے اُنہیں نہیں لگتی۔ ان کی اپنی عادتیں ہیں۔ اپنا رہن سہن ہے۔ کوئی بُرائی انہیں بُرائی ہی نہیں لگتی۔ دیر سویر جو بھی جاتا ہے۔ اُن میں رنگ جاتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں شہلا۔" میں نے کہا۔ "ان میں بھی بہت سارے اچھے لوگ ہیں۔ ورنہ یہ صنعت چل ہی نہیں سکتی تھی۔ شاید ہم لوگوں کی صحیح لوگوں سے ملاقات نہیں ہو پا رہی۔"

"ہو سکتا ہے" شہلا نے کہا۔ "لیکن میرا تو دو تین چاول دیکھ کر ہی دل سیر ہو گیا۔ اب تو مجھے ان کے تصور سے ہی اُبکائی آتی ہے۔"

"جب ہی تو یہ لائن بدنام ہے" امّی نے کہا۔ "کوئی شریف آدمی اپنی بہو بیٹی کو بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔"

"شہلا خوش ہوئی۔ پہلی موقع تھا کہ امّی، اس کی طرف سے بول رہی تھیں۔ میں جھنجھلا گیا۔

"چاہے جو بھی ہو" میں نے کہا "اس طرح دو دن پہلے تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سب کام چوپٹ ہو گیا۔"

شہلا کا چہرہ اُتر گیا۔

"تم چاہو تو اب بھی سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"اب تو میں فیصلہ کر چکی ہوں، منّے بھائی۔" شہلا نے دبی آواز میں کہا۔ پہلی بار میرے سامنے اُس نے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ اِس فلم کی مہورت ہو بھی گئی تو یہ فلم نہیں بن سکے گی۔"

"کیوں" آپا نے پوچھا۔

"صفدر بھائی کا منشا کچھ اور رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صفدر بھائی کا فلم بنانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ بزنس مین ہیں سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھاتے ہیں۔"

"پھر اتنا سب کچھ کیوں کیا انہوں نے ؟"

"یہ آپ کو بھی معلوم ہے" شہلا نے کہا۔

بات اس قدر صاف اور سیدھی تھی کہ سب سپٹا گئے۔ صفدر بھائی یہ سب شہلا ہی کے لئے تو کر رہے تھے۔ اسی لئے وہ مجھے بطور منیجر رکھنے کے لئے تیار تھے۔ فوزیہ کی شادی مجھ سے کروا رہے تھے۔ لیکن اُس کا اس قدر صاف صاف گفتگو کرنا مجھے بُرا لگا۔ بہرحال وہ مجھ سے چھوٹی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر تم مت کام کرو۔" میں غصّے سے اُٹھ گیا۔

"تو پھر ہم لوگ فوزیہ کے لئے جا دیں یا نہ جاویں" امّی نے پوچھا۔

"نہیں فی الحال اس کی ضرورت نہیں" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے کپڑے تبدیل کئے اور موہن کمار سے ملنے چلا گیا۔

میرے منع کرنے کے باوجود امّی، آپا کو لے کر اُسی روز دوپہر میں

شنو خالہ کے گھر گئیں۔ بعد میں آپا نے بتایا کہ شنّو خالہ کی گفتگو کا ڈھنگ اُس روز کچھ اور نیارا تھا۔ کبھی تولہ، کبھی ماشہ، گھڑی میں کچھ، گھڑی میں کچھ۔ پہلے تو دیکھتے ہی ہڑ گیں آج ادھر کہاں بھول پڑیں پہلے تو یہ وسوسہ ہوا کہ کہیں شہلا سے بات پکی تو نہیں ہو گئی جبکی کٹی سنانے لگیں۔ پھر کچھ دیر بعد جب ان کی سمجھ میں آیا کہ ہم لوگ فوزیہ کے لئے گئے ہیں۔ تو انہیں خیال ہوا کہ شاید ہم لوگ اس طرح شہلا کے لئے راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے صاف صاف کہا، کس برتے پر تتا پانی۔ منّے میاں آخر کرتے ہی کیا ہیں جو وہ اپنی لڑکی انہیں اُٹھا کر دے دیں۔ امّی نے بات بنائی کہ اُسے کام کی کیا ضرورت۔ اس کے ابا اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ وہ زندگی بھر موج کر سکتا ہے۔ اس پر تھوڑی نرم پڑیں۔ بولیں فوزیہ کے ابا سے بات کر کے جواب دیں گے۔ اس طرح امّی کا جانا ایک طرح سے رائیگاں ہی گیا۔ شنّو خالہ راضی نہ ہوں گی۔ اس کا تو مجھے اندازہ تھا ہی۔ مگر امّی کی بات رائیگاں جانے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ شنّو خالہ پر غصّہ بھی بہت آیا۔ مگر وہ سیدھے سوچے بیٹھی تھیں کہ اگر شہلا کی طرف سے صفدر کو مایوسی ہوئی تو یقیناً فوزیہ کے لئے بات کریں گے۔

چھبیس

موہن کمار نے میرا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔

"اتنے دنوں کہاں رہے بھائی"، مجھے دیکھتے ہی اُس نے ہانک لگائی۔ "سُنا بڑی فلمیں بن رہی ہیں۔"

مجھے خوشی ہوئی۔ آدمی ہو تو ایسا میں نے سوچا۔

"ابھی ایک ہی تو فلم اناؤنس ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر کب کر رہے مہورت، بھئی ہمیں بھی بلا لیا ہوتا۔"

"واہ، آپ کو کیسے نہ بلاتے۔ آپ کے مشوروں کے بغیر بیڑا پار نہیں ہو سکتی۔" میں بھی کچھ فلمی انداز سیکھ گیا تھا۔ "مگر مہورت ٹل گئی ہے۔"

"اچھا، اچھا۔ ہیرو نخرے کر رہا ہو گا۔"

"جی"

"شہلا تو مزے میں ہے؟"

"ہاں ٹھیک ٹھاک ہے"

"بار کئی بار سوچا، تمہارے گھر آنے کو مگر بس ایسی مصروفیت رہی کہ وقت ہی نہ نکل پایا۔ خیر پھر کبھی آئیں گے۔"

میں دو گھنٹے رہا۔ مگر ماحول میں تبدیلی نہیں پائی۔ ہر چیز ویسی کی ویسی تھی۔ ریڈی بھی بڑے تپاک سے ملا۔ فلم کے متعلق پوچھتا رہا۔ کیا

بجٹ ہے۔ کیمرہ مین کون ہے۔ کون ڈائرکٹ کرے گا۔ لوگوں کو اس قدر جوش سے ملتے دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔ یہ سب فلم کی اناؤنسمنٹ کا نتیجہ تھا۔ ہر شخص بچھا جا رہا تھا۔ دو ایک نے تو صاف صاف کہا کہ یار کوئی کام ہو تو بندہ حاضر ہے۔

خود موہن کمار نے مجھ سے کہا کہ یار اگر پارٹی اچھی تھی تو ہمارے پاس لے آتے۔ ہم چھ مہینے میں فلم مکمل کر کے دے دیتے۔

گھر پر آیا تو جاوید بھائی اور جوشی حسبِ معمول بیٹھے ہوئے تھے۔ امّی اور آپا تو شنو خالہ کے گھر گئے ہوئے تھے۔ شہلا اُن سے گفتگو کر رہی تھی۔ جاوید بھائی اب بھی اُسے قائل کرنے کی کوشش میں تھے۔ جوشی بھی حتی المقدور ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر شہلا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور پھر خود غائب ہوئی تو رات کے کھانے پر ہی نظر آئی۔

جاوید بھائی کو میں نے تمام باتیں تفصیل سے بتائیں۔

"منّے بھائی، آپ کو زور ڈالنا نہیں آتا۔" جاوید بھائی نے کہا "آخر آپ سے چھوٹی ہے۔ میری چھوٹی بہن ہوتی تو ڈانٹ ڈپٹ کر کیمرے کے سامنے کھڑا کر دیتا۔"

یہ واقعی میرے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ خود ہی مجھ سے مرعوب تھی ورنہ میں نے تو اسے کبھی گھرکا بھی نہ تھا۔ مجھے تو حیرت اس بات پر تھی کہ میری بات اُس نے ٹالی کیسے۔ یقیناً اُسے بھی اس بات کا افسوس ہی ہوگا۔ اب اچانک میں کیسے اپنا رویّہ بدل دیتا۔؟ اس کے علاوہ میرے لاشعور میں کہیں یہ بات یقیناً پوشیدہ تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ اگر اپنا مستقبل سنوارنے کا بھوت سر پر سوار نہ ہوتا تو میں کبھی بھی۔

اپنی بہن کو ایسے ماحول میں بھیجنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ جس میں جنس کھانے پینے کی اشیاء سے زیادہ ارزاں تھی۔ عورت کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ ایسے ماحول میں ایک نوخیز لڑکی کو بھیج دینا۔ شیروں کے آگے بھیڑ کو ڈال دینا تھا۔ بظاہر سب ملنسار تھے۔ جانثار مگر بباطن سب کو اپنی پڑی تھی، دھوکہ دھڑی تو یہاں کوئی بات ہی نہ تھی۔ مجھے خود اپنی غرض نے اندھا کر دیا تھا مگر اپنی غلطی کا احساس بہرحال تھا۔

جاوید بھائی کی بات پر میں خاموش ہو رہا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" جوشی نے کہا۔

جاوید بھائی بڑے رجائیت پسند آدمی تھے۔ انہیں یاد آیا کہ ایک ڈائرکٹر موزوں فلمی کہانی کی تلاش میں ہے۔

"چلو اُس سے مل آتے ہیں" انہوں نے کہا "کام تو اپنا سب کیا ہوا ہے ہی، ممکن ہے بات بن جائے۔"

مجھے اُن کی ہمت اور اُمید پرستی پر تعجب ہوا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ان کے لئے صدق دل سے دُعا کی خدا انہیں کامیاب کرے۔

•

میں سمجھ رہا تھا کہ صفدر بھائی میرے نہ جانے پر ناراض ہوں گے۔ دو روز وہ نہیں آئے، تیسرے روز سہ پہر میں آئے تو اسی تپاک سے ملے۔

"تو منّے ہماری تجویز پسند نہیں آئی" ہنستے ہوئے بولے۔ "ہم نے تو بھئی تمہارے بھلے کو ہی کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلموں سے ابھی تمہارا دل سیر نہیں ہوا۔"

میں کیا کہتا۔ ہنس کر چپ ہو رہا۔

"بہر حال، منّے ہماری آفر اب بھی قائم ہے" انہوں نے کہا "جب بھی جی چاہے۔ آ سکتے ہو"

اس کے بعد وہ امّی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"خالہ بی، سنا آپ شنّو خالہ کے گھر گئیں تھیں۔"

امّی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"ہاں گئی تو تھی" ان کی آواز پست تھی۔

"منّے کے لئے"

"ہاں" امّی کی آواز اور پست ہو گئی۔

"پھر، کیا کہا انہوں نے"

"کہتی کیا، یہی کہ فوزیہ کے ابّا سے پوچھ کر جواب دیں گی۔"

صفدر بھائی کو تو ہر بات کا علم تھا۔ وہ فضا تیار کر رہے تھے امّی کی بات سنتے ہی ایک دم جلال میں آ گئے۔

"آپ سے انہوں نے اس طرح گفتگو کی؟" "آپ کو وہاں جانا ہی نہیں چاہیئے تھا۔

"جانا تو لڑکے والوں کو ہی پڑتا ہے" امّی نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ ہم سے کہتیں" صفدر بھائی بلند آواز میں بولے "مجال تھی ان کی

انکار کر دیتیں ۔"

"انکار تو انہوں نے اب بھی نہیں کیا ۔" امی بڑے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"یہ آپ کہہ رہی ہیں خالہ بی ؟ آخر اور انکار کیسے کیا جاتا ہے ۔"
صفدر بھائی کی آواز میں جھنجھلاہٹ بھی تھی اور زور بھی ۔
میں اٹھ کر گیلری میں آگیا ۔ مگر ان کی بلند آواز وہاں بھی پہنچ رہی تھی ۔

"سنا ہے انہوں نے منے کے متعلق بھی کچھ کہا ؟"
"ایسا تو کچھ نہیں کہا ۔" امی بولیں "وہ کہہ رہی تھیں کہ منے کی اپنی بات تو کچھ ہے نہیں ۔ ہم نے کہا ۔"
صفدر بھائی اُن کی بات کاٹ کر بولے ۔
"ان کی یہ مجال ، ہم نے تو خود شنو خالہ سے کہا کہ بھلا آپ نے یہ بات سوچی کیسے ، منے میاں اور ہم کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں ۔ ہم نے خود انہیں اپنا بنیجر بنانے کا وعدہ کیا ہے ۔ اور اگر وہ کام نہ بھی کرنا چاہے تو ہم تا عمر اس کا اور اس کے گھر کا خرچ اٹھا سکتے ہیں ۔ آخر ہم نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے ۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے ۔ آپ ہی بتایئے خالہ بی کیا اتنا بھی حق ہمیں نہیں پہنچتا ؟"

میں نے جھانک کر دیکھا امی کا چہرہ غیرت سے سرخ ہو گیا تھا ۔ وہ پسینے پسینے ہو رہی تھیں ۔ مارے غیرت کے وہ کچھ کہہ ہی نہ سکیں ۔ ویسے بھی انہیں تڑاخ پڑاخ بولنے کی عادت نہ تھی ۔ چپ چاپ سنتی رہتیں اور اندر ہی اندر کڑھا کرتیں ۔ جھگڑے کے نام سے ان کی روح فنا

ہوتی تھی۔ یہی صفدر بھائی تو جنہیں ایک دو نہیں پورے گیارہ برس ابا نے اپنے پاس رکھا تھا۔ تعلیم دلوائی تھی۔ دوبار میٹرک میں فیل ہونے کے باوجود کالج میں داخلہ کروایا تھا۔ سارے اخراجات برداشت کئے تھے۔ آج وہ ہمیں ہی ملاحیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

مجھے خود سے نفرت ہونے لگی۔ اس وقت دو باتیں ہیں صفدر کو سنا دیتا تو بعد کو غم نہ ہوتا۔ مگر پھر ہمیشہ کی طرح مصلحتوں نے اس وقت بھی میری زبان سی دی۔ صفدر سے تعلقات ختم کرنے کا مطلب تھا فوزیہ سے ہاتھ دھو لینا۔ شنّو خالہ کی صفدر بھائی وقت بے وقت مدد کرتے رہتے تھے۔ فوزیہ کی کالج کی فیس وہی ادا کرتے تھے۔ شنّو خالہ کے شوہر بھی اُن کے سامنے چوں نہ کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر میں ان سے زیادہ صفدر بھائی کا عمل دخل ہے۔

ماحول اُسی طرح تنا ہوا رہتا اگر شہلا نہ آجاتی۔ وہ اور آپا فلم دیکھ کر آئے تھے۔ آتے ہی اُس نے بڑے جوش و خروش سے فلم پر گفتگو شروع کر دی۔

اُسے دیکھتے ہی صفدر بھائی کا موڈ بھی بالکل بدل گیا۔ امی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ یقیناً وہ جی کھول کر روئی ہوں گی۔ میں نے سوچا اُنہیں جا کر دلاسہ دوں۔ مگر کس منہ سے؟ ساری ذلتیں میرے ہی لئے تو ہو رہی تھیں؟ میرا دماغ صحیح ہوتا تو اُسی وقت میں گھر سے نکل جاتا۔ کسی کو منہ نہ دکھاتا۔ رو دھو کر امی کو صبر آ ہی جاتا۔ یہ روز روز کے صدمے تو نہ ہوتے۔ میں بھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

کچھ دیر بعد آپا نے چائے کے لئے بلایا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ موہن کمار آگیا۔ اُسے دیکھ کر میرا موڈ بحال ہو گیا۔ انہیں ہم نے صفدر سے ملوایا صفدر بھائی بھی بڑے تپاک سے ملے۔

"تو یہ فلم غمِ دل اگر نہ ہوتا، آپ ہی بنا رہے ہیں؟"

"جی ہاں، یہ ہمارے منے جو ہیں۔ انہیں فلم بنانے کا شوق ہے، ہم نے کہا ٹھیک ہے دس پانچ کا معاملہ ہو تو ہم لگا دیتے ہیں۔ ایک تجربہ یہ بھی سہی۔"

"کہانی تو اچھی ہے۔" موہن کمار نے صفدر بھائی سے کہا حالانکہ اُس سے اس سلسلے میں کبھی کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ فلمی داؤ پیچ تھے۔ مجھے ہنسی آئی مگر میں نے ضبط کر لیا۔

"اگر ٹھیک سے بن جائے تو اچھا بزنس کرے گی۔"

اب صفدر بھائی کے کان کھڑے ہوئے۔

"ہم نے تو ان لڑکوں پر یہ چھوڑ دیا ہے۔" صفدر بھائی نے کہا۔ "جوشی ہیں ایک صاحب آپ تو واقف ہوں گے۔"

"جی ہاں، وہ دو تین ڈائرکٹروں کے ساتھ کام کر چکا ہے۔"

"بس اُس کو سونپا ہے یہ کام۔" صفدر بھائی نے کہا۔

"تھوڑا سُنا پھر ملتوی ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں۔" صفدر بھائی نے کہا۔ "جس اداکار کو انہوں نے لیا ہے صاحب وہ بھی عجیب آدمی ہے۔ تھوڑا سا میں اتنے نخرے دکھا رہا ہے۔ آگے پتہ نہیں کتنی ناک رگڑوائے گا۔"

"ہاں جی۔ اس لائن میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔" موہن کمار

نے کہا۔

"کیا کیا جائے سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"مومن صاحب ہمارا تو یہ مزاج نہیں" صفدر بھائی نے کہا۔
"جس دن ہمارا ناریل چٹخا ہم تو صاحب۔ وہ نادر شاہ والی بات یاد ہے آپ کو؟"

"کون سی بات؟"

"وہی، جو اُس نے ہاتھی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا کہ جس سواری کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں نہ ہو بھلا ہم اُس پر کیسے سوار ہو سکتے ہیں۔ تو صاحب ہم بھی اس کے قائل نہیں کہ پیسے ہم لگائیں بزنس ہمارا اور لگام جناب بے لگام ہیرو کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تو ہم ان لوگوں کی خاطر یہ سب کچھ برداشت بھی کر رہے ہیں۔ ورنہ ہم دو دن میں اس کے مزاج درست کر دیں کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے کہ کوئی ملا تھا۔"

شہلا اور میں حیرت سے اُن کی لن ترانیاں سُن رہے تھے لیکن مومن کمار بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ صفدر بھائی کی نگاہیں جس طرح بار بار شہلا پر پڑ رہی تھیں اُس سے وہ تاڑ گیا کہ معاملہ ہے۔
کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا تو میں اُسے رخصت کرنے کے لئے ساتھ ساتھ باہر آ گیا۔ زینے سے اتر کر ہم باہر سڑک پر آئے تو اُس نے کہا۔

"یار سعید میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا چکر ہے۔ صاف صاف بتاؤ یہ آدمی تو بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ اتنا پیسہ فلم پر لگانے

دالا نہیں۔"

"میری بھی سمجھ میں نہیں آتا۔"میں بھی گول ہو گیا"۔کبھی کبھی مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ یہ فلم بنے گی نہیں۔"

"پھر تم کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔؟" موہن کمار نے کہا۔"اسٹوڈیو پر آنا بھی تم نے کم کر دیا ہے۔"

"اب آؤں گا۔"

ہم دونوں اس کی گاڑی کے قریب کھڑے گفتگو کر رہے تھے مگر اُس نے بجائے گاڑی میں بیٹھنے کے اچانک مجھ سے کہا۔

"آؤ یار، کہیں بیٹھتے ہیں، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں"۔

ستائیس

ہم ایک لوگ نزدیک کے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔

"ایک بہت اچھی پارٹی ملی ہے"۔ بیٹھتے ہی اس نے چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔" اور یہ فلم یقیناً پوری کرنی ہے۔ اس بار میں طے کر چکا ہوں۔ کیوں کہ پارٹی بہت ساؤنڈ ہے۔ میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اگر اسے ایک بار نفع دکھا دیا تو سمجھو مرید ہو گئی۔ تم تو پروڈکشن انچارج ہو گئے ہی۔ دو پانچ لاکھ زیادہ بھی خرچ ہو گیا۔ تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے سر ہلایا۔

"مگر پھر مشکل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں" اس نے کہا۔

بیرا چائے رکھ رہا تھا۔

"ذرا چائے پی لیں۔"

چائے کے دو گھونٹ لے کر اس نے کپ ہاتھ سے رکھ دیا۔

"دیکھو سب کچھ پارٹی نے مجھ پر چھوڑ دیا ہے" اس نے کہا "کہانی کا انتخاب، کاسٹنگ، کیمرہ مین، کوئی قید نہیں سمجھ رہے ہو نا۔ سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے۔ پارٹی کو فلم کے متعلق کچھ معلوم نہیں، بس دو نمبر کا پیسہ ہے اور فلم بنانے کا شوق۔ لوگ بھی سیدھے ہی ہیں۔ بس ایک ہی مشکل ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال کوئی اچھی کہانی میرے پاس نہیں، ویسے تو میرے پاس درجنوں کہانیاں ہیں۔ مگر تم جانتے ہو۔ اب پبلک ٹیسٹ بہت بدل گیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کوئی نیا موضوع لے کر فلم بنائی جائے۔" موہن کمار نے پھر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"جاوید انور جوشی ایک کہانی پر کام کر رہے ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے تو یار تیار اسکرپٹ چاہیے" موہن کمار نے کہا "جسے میں فوراً سیٹ پر ڈال سکوں۔"

"کہانی تیار ہے ان کے پاس" میں نے کہا "شاید کسی سے

بات بھی چل رہی ہے اُن کی"

"تم نے پڑھی ہے کہانی؟"

"ہاں میں نے پڑھی ہے۔ بلکہ ڈس کس بھی کیا ہے۔"

"تمہیں پسند ہے"

"میرے خیال سے تو بہت زبردست فلم بنے گی اُس پر" میں نے بھی فلمی انداز میں کہا۔

"پبلک ٹیسٹ کی ہے۔"

"ہاں اُسی حساب سے تو کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم دونوں کو بھیج دو" موہن کمار نے کہا "بس اسی کے لئے میں پریشان تھا"

ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے چہرے کا تناؤ واقعی کچھ کم ہو گیا ہو۔

"اچھا وہ انجینئر آیا تھا آپ کے پاس"

"وہ چندر کانت"

"ہم!"

"وہ تو کئی بار آیا۔ اپنی لڑکی کو لے کر"

"کیوں؟ تمہیں ہے دلچسپی؟" موہن کمار ہنستا۔

میں گھبرا گیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" میں نے کہا۔

"ارے ہم سب جانتے ہیں بیارے" موہن کمار نے کہا۔ "بلوا دیں اُسے؟"

"ارے نہیں" میں نے کہا۔

"چھوڑو یار، تم خواہ مخواہ شرما رہے ہو۔ یار اب تم بالغ ہو گئے ہو۔ مردوں والی بات کرو۔"

"میں تو محض یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ اُسے بھی رول دے رہے ہیں یا نہیں؟"

"وعدہ تو کیا ہے، مگر ہیروئین کا نہیں۔"

"پھر"

"دو ایک ناچ رکھ دیں گے" اُس نے کہا "اس کی تو گنجائش ہے نا کہانی میں، تم تو پڑھ چکے ہو کہانی"

"ہاں ناچ تو ہیں کہانی میں"

"بس پھر۔ اس کا مسئلہ بھی حل ہوا" اُس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو کل تم بھیج رہے ہو جوشی کو۔"

"بالکل، بلکہ ہو سکا تو ساتھ لیتا آؤں گا۔"

اٹھائیس

واپس آیا تو صفدر بھائی جا چکے تھے۔ جاوید بھائی سات بجے تک نہیں آئے تو میں نے ہوٹل سے انہیں فون کیا۔ فون دراصل اُن کے پڑوس میں تھا۔ شریف لوگ تھے۔ جاوید بھائی کو فوراً بلا بھیجا۔

"جاوید بھائی آج آپ آئے نہیں۔" میں نے پوچھا۔

"آں۔ ہاں۔ یار۔ ایسا ہوا" جاوید بھائی ذرا بوکھلائے۔

"جاوید بھائی آپ کو اعتماد سے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔ "اسی لئے تو آپ کامیاب نہیں ہوتے۔"

"میرا مذاق اُڑاتے ہو" سور" جاوید بھائی بھی ہنس پڑے" کیا بات ہے"

"آپ فوراً گھر آئیے۔"

"شہلا مان گئی کیا؟ اسی وقت۔"

"نہیں" میں نے کہا "ایک اور تجویز آئی ہے"۔

"اب ہٹاؤ یار" جاوید بھائی ٹھنڈے پڑ گئے۔ "ہماری قسمت ہی سالی خراب ہے۔ کس واہیات فرشتے نے لکھی تھی پتہ نہیں۔"

"بہت اچھی تجویز ہے" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ آئیے تو۔ اس بار کام بننے والا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو آجاتا ہوں۔ اکیلے آؤں یا جوشی کو بھی ساتھ لے آؤں" ان کی آواز ویسی ہی بجھی بجھی سی تھی۔

"وہ بھی آجاتا تو اچھا تھا" میں نے کہا۔

جاوید بھائی، جوشی کو لے کر آئے تب تک میں شہلا سے بات کر چکا تھا۔ حالانکہ موہن کمار نے مجھے اس کا اشارہ بھی نہیں دیا تھا۔ ظاہر ہے شہلا کو لینے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ لڑکی فلم کے لئے موزوں نہیں۔ جو تماشہ موہن کمار کے گھر پر ہوا تھا اس کے بعد مجھے اُمید بھی نہیں تھی کہ شہلا راضی ہوگی۔ مگر میں نے مناسب سمجھا کہ کم از

کم اس سے گفتگو کر لوں۔

شہلا کا موڈ موہن کمار کا نام سنتے ہی خراب ہو گیا۔

"اس کی تو میں صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی" اُس نے کہا۔

"پھر بھی سوچ لو۔ یہ فلم تو وہ بنائے گا ہی۔"

"میں نے کہا نا منے بھائی، اور آئندہ آپ میرے سامنے اس کا نام بھی مت لینا۔"

"تم بھی کمال کرتی ہو" میں نے کہا "اس وقت خود موہن کمار کو ضرورت ہے اور اُس کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اُسے محض کام سے مطلب ہے۔"

"منے بھائی اب میرا دل ہی نہیں چاہتا تو میں کیا کروں" شہلا نے کہا۔ "آپ لوگ اگر مجھ پر اور دباؤ ڈالیں گے تو میں کہیں چلی جاؤں گی۔"

اس کا گلا رندھ گیا۔ مجھے بھی دھکا لگا۔

"شہلا تم غلط سمجھ رہی ہو" میں نے کہا۔ دباؤ ڈالنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں تو اسی لئے کہہ رہا تھا کہ تمہیں خود فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔"

"تھا کہیئے" اُس نے کہا "اب تو فلم کے نام سے چڑ ہے۔"

"شہلا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم نے صرف تاریک رُخ دیکھا ہو" میں نے کہا۔

"معاف کیجئے! مجھے روشن رُخ دیکھنا بھی نہیں۔ یہاں کی روشنی تو شاید اور بھیانک ہو گی۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جاوید بھائی جوشی کو لئے داخل ہوئے۔ میں نے موہن کمار کی تجویز اُن کے سامنے رکھی۔

جاوید بھائی نے تو کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ مگر جوشی نے کہا مل لینے میں کیا حرج ہے۔ فینانسر کو پکڑنا آسان نہیں۔" اس نے کہا۔ "اگر موہن کمار کے پاس پارٹی ہے تو ٹھیک ہے۔ اسکرپٹ دکھا دیتے ہیں۔ کہانی اور اسکرپٹ کے تو پیسے مل جائیں گے۔ اگر وہ مجھے ڈائرکشن میں اسسٹنٹ کے طور پر لے لیتا ہے تو اُس کے بھی پیسے مل جائیں گے۔"

"تمہاری فلم ڈائرکٹ کرنے کی حسرت لیکن دل میں رہ جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کام چلتے رہنا چاہیئے۔" جوشی نے کہا۔ "چانس جب قسمت میں ہو گا مل ہی جائے گا۔"

انتیس

اگلے روز میں دونوں کو موہن کمار کے پاس لے گیا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اسٹوڈیو میں کھایا۔ کہانی سنانے کے لئے اُس کے فلیٹ پر چلنا پڑا۔ شراب کی بوتل کھلی۔ کچھ گزک ہم نے راستے میں ہی لے لی تھی۔ ایک آدھ پیگ تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرا پیگ بھرنے کے بعد موہن کمار نے جاوید بھائی سے کہا۔ "ہاں اب کہانی سناؤ۔ لیکن ٹھہرو۔" اس نے گھنٹی بجا کر اپنے ملازم کو بلایا اور اسے بھی فرش پر بٹھا دیا۔

مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ ہنسی بھی آئی مگر جاوید اور جوشی

جیسے پہلے سے جانتے تھے۔ "دیکھو ایک بات آج سمجھ لو" موہن کمار نے مجھ سے کہا۔ "فلمیں تمہارے ہمارے جیسے لوگوں سے نہیں چلتیں۔ اگر کہانی اسے پسند آ گئی تو سمجھو فلم ضرور چلے گی۔ کیونکہ یہ لوگ ایک ایک فلم دس دس بار دیکھتے ہیں۔"

"آج کل تو یہ روش ہو گئی ہے کہ پروڈیوسر پورے خاندان سمیت کہانی سُنتے ہیں۔ اور ان کی رائے ہی فائنل ہوتی ہے" جاوید بھائی نے کہا۔

کہانی پر واقعی دونوں نے بہت محنت کی تھی، تھی تو عام فلموں جیسی مگر عوام کی پسند کے مطابق بنائی گئی تھی۔ غیر ملکی فلموں کے بھی اس میں کئی ٹکڑے تھے۔ محبت، نفرت، انتقام، قتل، مار دھاڑ سیکس، بھی کچھ مسالہ اس میں تھا۔ موہن کمار کے نوکر کو کہانی بہت پسند آئی۔ خود موہن کمار نے تعریف کی اور گیارہ روپے، اُس نے فوراً بطور سائن کرنے کی رقم کے جوشی کے ہاتھ میں رکھ دے۔ جوشی کو اُس نے بطور معاون ہدایت کار لینے کا بھی وعدہ کیا، ویمپ کا رول اُس نے شانتا کو دیا۔

"کہانی بہت اچھی ہے" موہن کمار نے کہا۔ "اس فلم کو ہم لوگ اچھے ہیرو ہیروئین اور موسیقار لے کر بنائیں گے۔"

باہر نکلے تو جاوید بھائی بہت خوش تھے۔ اگر فلم بنی تو پہلی بار اُن کا نام پردے پر جگمگائے گا۔ جوشی بھی مطمئن تھا۔ مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ میری اتنے دن کی ریاضت شاید سپھل ہو جائے۔

گھر پہنچا تو چار بج چکے تھے۔ آپا نے کھانا پروسا۔ میں روٹی کھا رہا تھا۔ تبھی آپا نے مجھ سے کہا۔

"تمنّے بھائی تمہیں کچھ پتہ چلا کہ نہیں" انہوں نے مجھ سے کہا۔

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"صبح صفدر بھائی آئے تھے،" آپا نے کہا "صفدر بھائی دیر تک امّی سے گفتگو کرتے رہے۔ شنو خالہ فوزیہ کی شادی تم سے کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

"اچھا" میں خوشی سے اچھل پڑا "اور کیا کہہ رہے تھے صفدر بھائی؟"

"کہتے کیا وہ تو آتے ہی اپنی بیوی کا رونا لے بیٹھے،" آپا نے کہا "کہ اس کے ساتھ ان کی زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ زندگی سے انہیں خود کوئی فیض نہیں پہنچا۔ اتنی دولت ہوتے ہوئے بھی ان کی قسمت میں کوئی خوشی نہیں۔ کوئی ان کے متعلق سوچتا تک نہیں۔ حالانکہ ـــــ انہوں نے سب کی بھلائی کے علاوہ کچھ سوچا بھی نہیں۔"

"ان کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد کیا ہوتا۔ وہ شہلا سے شادی کرنا چاہتے ہیں!"

"وہ تو خیر ظاہر ہی ہے۔ ورنہ وہ اتنے دن پھیرے کس لیے کر رہے تھے۔"

"پھر امّی نے کیا جواب دیا۔"

"انہوں نے کہا کہ وہ منّے سے بات کر کے جواب دیں گی"۔

"میری شادی کے متعلق اور کوئی بات نہیں ہوئی ؟"

"کہہ رہے تھے کہ منّے کی شادی کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کریں گے، گھر کے فرد کی حیثیت سے ساری ذمہ داری اب اُن پر ہی ہے۔ اور وہ اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھیں گے۔ مگر خالہ بی ان کے متعلق بھی کچھ سوچیں۔ اتنی بڑی گرہستی جائداد، بکھیڑے، شہلا جیسی سُگھڑ لڑکی ہی سنبھال سکتی ہے۔ ورنہ خاندان میں انہیں تو اور کوئی لڑکی نظر نہیں آتی"۔

پے در پے کامیابیوں نے مجھے بالکل تازہ دم کر دیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے اور سمندر کنارے چلا گیا۔ فوزیہ کو میں نے جب بھی دیکھا۔ اس کے متعلق جب بھی سوچا مجھے وہ اپنی دسترس سے بہت دُور لگی جس کا حصول میرے لئے تقریباً ناممکن تھا اور ایک دم اتنے نزدیک پا کر خوشی میرے جسم سے جیسے اُبلنے لگی۔ یہ خوشی اتنی اچانک اور شدید تھی کہ شہلا کے متعلق میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ میرا ذہن اور کچھ سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوا۔

میں ریت پر لیٹ گیا، سر کو ہاتھوں سے ٹکائے نیل گگن مجھے بہت ہی بلند لگا۔ جیسا کہ اس کی انتہا ہی نہ ہو۔ بہت اوپر کبوتروں کی ٹکڑی اڑتی چلی جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بلند اور بلند ہوتی جا رہی تھی اور اونچی ہوتے ہوئے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ قدرے کم اونچائی پر دو تین چیلیں بڑے سبک انداز میں

اڑ رہی تھیں جیسے تیر رہی ہوں۔ کبھی بہتے ہوئے نیچے آجائیں پھر اونچی اور اونچی ہوتی چلی جاتیں۔ کبھی اڑتے اڑتے ایسے محسوس ہوتا جیسے رک گئی ہوں۔ دیر تک میں یہ منظر دیکھتا رہا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ان پرندوں کے ساتھ میں خود تیر رہا ہوں۔

ساحل پر خوبصورت چہرے تھے۔ کلکاریاں مارتے ہوئے بچے، نوخیز جوڑے کہیں لوگ بھیل پوری پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کہیں آئس کریم سے دل کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا۔ قلفی والوں کی صدائیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ساحل پر جا بجا سر سے سر ملائے نوخیز جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ دور جہاں تک نظر جاتی تھی پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ میری آنکھیں یہ منظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ بے وجہ ہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ ساحل پر دوڑوں، کودوں، قہقہے لگاؤں، اپنی اس کیفیت کو برداشت کرتے ہوئے میں سڑک پر آگیا۔ سمندر سے ملی سڑک پر رکھی بنچ پر دو پارسی جوڑے شاید اپنے معمول کے مطابق بیٹھے کسی ورد میں مشغول تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا دھاگا تھا جسے "کستی" کہتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے اس پر وہ بار بار ہاتھ پھرا رہے تھے۔ سڑک کی دوسری طرف گرلز ہاسٹل ہونے کی وجہ سے ساحل پر لڑکیوں کی ٹولیاں بھی چہل قدمی کرتی نظر آرہی تھیں۔ کاروں کا تانتا تھا کہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ ابھی یہ منظر میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک سڑک کے درمیان میں لگے قمقمے جل اٹھے، دور سے وہ ایک خوبصورت سے نیکلس کی شکل میں نظر آرہے تھے۔ اونچی اونچی عمارتوں پر اشتہاری بتیاں جگ مگ جگ مگ کرتے

لگیں۔ اور ان کے بدلتے رنگوں کا عکس سمندر میں جھلملانے لگا۔ میں سمندر کے کنارے منڈیر پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے اندر روشنی کے فوارے سے اُبلتے محسوس ہو رہے تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے رات نے ہر چیز سمیٹنا شروع کر دیا۔ بچے، نوخیز لڑکیاں، پارسی بوڑھے، نوجوان جوڑے کبوتر، چیلیں، کاریں سب کم ہوتی چلی گئیں۔ بس دور تک خالی سڑک تھی، قمقمے، تنہا رکی بتیاں اور سمندر کی ڈراونی آواز۔ دل پتہ نہیں کیوں اُداس ہو گیا۔ جتنی شدید لہر خوشی کی آئی تھی ویسی ہی سرد مایوسی کی لہر نے دل کو جکڑ لیا۔ خوشیاں تمہارے نصیب میں کہاں ؟ میں نے خود سے کہا۔ تم ایک مجہول، بے عمل انسان ہو۔ ناتجربہ کار اور بوڑھے مگرمچھ تمہیں نگلنے کے لئے تیار ہیں۔ تمہاری خیالی دنیا ان مگرمچھوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

میں بوجھل قدموں سے اٹھا اور بس اسٹاپ پر آ کھڑا ہوا۔

تیئیس

امّی باورچی خانے میں تھیں۔ آپا جا نماز پر بیٹھیں وظیفے میں مشغول، شہلا کوئی رسالا الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ گھر بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔ مگر مجھے فضا میں بہت تناؤ معلوم ہوا۔ شہلا خاموش تھی مگر اس کا چہرہ اُترا ہوا۔ ایسا لگتا تھا ابھی رو

دے گی۔ اس نے کئی بار کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ مگر جیسے ہی اس کی طرف سر گھمایا اُس نے اپنی نظریں دوبارہ رسالے پر جمادیں، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ کسی سے بات کرنے کو خود میرا اپنا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں ریڈیو چلا کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔ کافی دیر بعد دل پر چھائے سیاہ بادل چھٹے۔

امّی نے کھانے کے لئے بُلایا۔ مسور پلاؤ بڑا لذیز بنا تھا مگر جیسے کسی کا کھانے کا من ہی نہ تھا۔ تھوڑا تھوڑا کھا کر ہر کوئی اُٹھ گیا۔ امّی نے پوچھا بھی کہ تم لوگوں کو یہ آج کیا ہو گیا ہے۔ پتیلی جیسی ویسی پڑی ہے۔ یہ اتنا بچا ہوا میں کس کو کھلاؤں گی۔؟ مگر کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ اب امّی مجھ سے گفتگو کریں گی۔ مگر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ شاید انہوں نے اُسے اگلے روز کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔ میں ہاتھ دھو رہا تھا تو شہلا نے مجھ سے کہا " منّے بھائی، مجھے آپ سے گفتگو کرنی ہے "،

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، اس کا لہجہ کچھ بھرآیا ہوا، کچھ تیز سا تھا۔

" اچھا میں آتا ہوں "۔ میں نے کہا۔

یہ تصویریں جو میری نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہیں شاید زندگی کے سب سے نازک لمحے ہیں۔ قدرت بار بار مجھے سنبھلنے کا موقع دے رہی تھی۔ مگر میری تو مت ہی ماری گئی تھی۔ اس وقت یہ لمحے بس یوں ہی سے معلوم ہوئے تھے مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اس لمحے پر اگر میں نے تھوڑی سی بھی سمجھداری سے کام لیا ہوتا تو حالات کا رخ وہ نہ ہوتا

جو بعد میں ہوا۔

دس منٹ تک میں یونہی اپنے کمرے کی چیزیں اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ دو سگریٹیں پی ڈالیں۔ وہ گیلری میں کرسی ڈالے باہر دیکھ رہی تھی۔ میرے گیلری میں قدم رکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بیٹھو" میں نے کہا۔

"نہیں، آپ بیٹھئے۔"

مگر میں بیٹھا نہیں۔ گیلری کی ریلنگ سے ٹکا باہر دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

وہ کچھ کھو سی گئی۔ پھر دانتوں سے ناخن کترنے لگی۔ پھر اُس نے نظر اٹھا کر بغور مجھے دیکھا اور بولی "منّے بھائی آپ کو پتہ ہوگا۔"

"ہاں آپا نے دوپہر میں بتایا تھا مجھے۔"

"امی نے آپ سے گفتگو نہیں کی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میں گیلری سے باہر دیکھنے لگا۔ رات کے نو بج رہے تھے مگر کاروں کا سلسلہ تھا کہ تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ آس پاس کی عمارتیں برقی قمقموں سے روشن تھیں۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا" میں نے کہا۔

"منّے بھائی" وہ سر جھکا کر تقریباً روتی آواز میں بولی "میری دلی تمنا ہے کہ آپ کی شادی فوزیہ سے ہو مگر ۔۔۔!"

اس کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں صفدر بھائی سے شادی نہیں کر سکتی۔ کسی قیمت پر نہیں۔"

اُس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اُسے تسلّی دیتا، اس کے آنسو پونچھتا۔ مگر میں سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتا رہا اور میری زبان سے یہ الفاظ نکلے "آخر صفدر بھائی میں کیا خرابی ہے۔؟"

اس نے تڑپ کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور حیران نگاہوں سے مجھے تاکا جیسے اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"صرف یہی نا کہ وہ عمر میں کچھ زیادہ ہیں تم سے؟" یہ کس کی آواز تھی۔ یہ آواز خود مجھے بھی اجنبی لگی۔ میری آواز تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

"کچھ زیادہ؟" اُس نے تعجب سے پوچھا۔

"شہلا تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو" میں نے کہا "تم بالکل ناتجربہ کار ہو۔ میں تم سے بارہ سال بڑا ہوں۔ اور میرا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ پیسوں کے بغیر آدمی دو کوڑی کا رہ جاتا ہے۔ جذبات سے ہٹ کر دیکھو گی تو تمہیں اپنا مستقبل صفدر بھائی کے ساتھ بالکل محفوظ نظر آئے گا۔"

"لیکن مجھے بھائی میں انہیں بالکل بھی پسند نہیں کرتی۔" شہلا نے غصّے میں کہا۔ "آدمی جس شخص کو پسند نہیں کرتا اس کے ساتھ زندگی کیسے بسر کر سکتا ہے۔؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں عمر بھر کنواری رہوں۔ میں کم از کم اپنا بوجھ تو اٹھا ہی سکتی ہوں۔"

"صفدر بھائی ایک بزنس مین ہیں" میں نے کہا "اور بزنس مین خیالی دنیا میں نہیں عملی دنیا میں رہتے ہیں۔ انہیں کبھی کبھی ناگوار قدم

بھی اٹھانے پڑتے ہیں اور وہ اس میں جھجکتے نہیں۔ تمہارا ذہن ابھی خام ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ تمہاری پسند ناپسند دس سال بعد یقیناً بدل چکی ہوگی۔ یہ دنیا ویسی نہیں شہلا جیسی ہم سمجھتے ہیں۔ ہم اسے رنگین عینک سے دیکھتے ہیں اور یہ ہمیں رنگین نظر آتی ہے۔ مگر حقائق اس قدر رنگین نہیں وہ اس قدر سیاہ ہیں کہ ہم اسے قبول بھی نہیں کر پاتے۔"

شہلا کے چلے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ یہ باتیں میں نے اس سے کیوں کہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ فوزیہ مل جائے یا میں واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ شاید کہیں میری اپنی مرضی پوشیدہ تھی۔ یا اندلوا۔ مجھے اپنی خام کاری کا شدید احساس ہوگیا تھا۔ کوئی بات ضرور تھی کہ جب میں صفدر، موہن کمار، درشن، چندر کانت جیسے لوگوں سے ملتا تھا تو رہ رہ کر مجھے یہی خیال آتا تھا کہ ممکن ہے میرے سوچنے کا زاویہ غلط ہو، ممکن ہے میں غلط ہوں۔ مجھے اس پر غصہ آتا تھا کہ جو زندگی کتابوں میں تھی، جس کا پرچار کیا جاتا ہے۔ بڑی سیدھی صاف اور خوبصورت تھی۔ جیسی کہ ہم چاہتے ہیں مگر جن حقائق سے عملی زندگی میں سابقہ پڑتا تھا وہ بڑے مکروہ اور کرب ناک تھے۔ یہاں دوستی کو بے وقوفی کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اس قدر نفسا نفسی کیوں ہے؟ یہاں ہر شخص اپنے ہی حلوے مانڈے کی فکر میں کیوں ہے؟ اندر ہی اندر شاید مجھ میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی جو اس روز پھوٹ نکلی۔ بارہا میں نے اپنے

روپے کا تجزیہ کیا ہوگا مگر یہ جاننے سے قاصر رہا کہ اس روز
شہلا سے میں نے اس طرح گفتگو کیوں کی جو کچھ میں نے کہا وہ
مجھے سچ معلوم ہوتا تھا مگر جب میں اپنے رویّے پر غور کرنے
لگا تو سوائے خود غرضی کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

اکتیّس

دس بجے جاوید بھائی آئے، کہنے لگے چلو یار موہن کمار
کے پاس چلتے ہیں۔ ہم لوگ گھر سے نکلے۔ راہ میں جاوید بھائی
نے پوچھا۔

"سُنا تم فوزیہ سے شادی کر رہے ہو؟"

"تم سے کس نے کہا؟"

"کل امّی نے بتایا۔ یار تم بھی خوب ہو۔ روزانہ ہی ملاقات
ہوتی ہے اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں"۔ جاوید بھائی نے شکایت کی۔

"آپ نے غلط سُنا جاوید بھائی" میں نے کہا "بات چیت تو
چل رہی ہے۔ مگر پکّی ہو جائے جب سمجھو"

"امّی تو کہہ رہی تھیں کہ بات چیت طے ہو چکی"

"بات چیت طے ہوتی تو آپ کو کیسے پتہ نہ چلتا!" میں
نے کہا۔ "چلو میں نہ کہتا۔ امّی یا آپا تو کہتیں"

"وہی تو، میں نے امی سے سنا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی!" جاوید
بھائی بولے "مگر تمہیں تو پسند ہے نا۔"
"ہاں مجھے تو ٹھیک ہی لگی۔" میں نے کہا "آپ کا کیا خیال
ہے۔"
"اچھی لڑکی ہے۔" جاوید بھائی نے کہا۔ "تمہارے لئے بالکل
مناسب، امی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ بہت اچھی جوڑی بنے گی۔"
معلوم نہیں کیا بات تھی جتنی رجائی صورتِ حال پیدا
ہوتی تھی۔ مجھے اتنا ہی زیادہ اختلاج ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا
کہ جب تک صفدر بھائی کے دم قدم بیچ میں ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا
ہے۔
اسٹوڈیو گئے تو پتہ چلا کہ مومن کمار کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم
نے اسٹوڈیو ہی میں چائے پی۔ خپ شپ کر کے بارہ بجا دیے۔
بھوک لگنے لگی تو گھر کا رخ کیا۔ جاوید بھائی کو کہیں جانا تھا۔
وہ وہاں نکل لیے۔ میں روٹی کھا رہا تھا کہ شہلا کا فون آیا۔ وہ
اپنی سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی۔
روٹی کھا کر میں حسبِ عادت تھوڑی دیر کے لیے گیلری
میں آ کر بیٹھ گیا۔ نیچے سڑک پر ایک لڑکی کتابیں ہاتھ میں لیے
سڑک پار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے فوزیہ کا خیال آیا۔
جب سے صفدر بھائی نے آنا شروع کیا تھا۔ فوزیہ ایک روز
بھی ہمارے گھر نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔ فوزیہ کا خیال آیا
تو پھر آتا چلا گیا۔ اسے دیکھنے کو جی چاہا۔ اور بہت رو کنے

پر کبھی نہ مانا۔ میں اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ دیر تک کروٹیں
لیتا رہا۔ ایسی بے چینی تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آخر میں اٹھا اور
کپڑے تبدیل کر کے نکلنے لگا تو امی نے پوچھا کہاں جا
رہے ہو۔

"بس ابھی آیا۔" میں نے جواب دیا۔

"چائے پی کر جانا تھا۔" امی نے کہا۔

"اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔"

"ٹھہرو۔۔۔ بنا دیتی ہوں۔"

امی نے چائے بنا کر دی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں گفتگو نہ
چھیڑ دیں مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ میں چائے پی کر باہر نکل آیا۔

"بس ملتے ملتے چار بج گئے۔ فوزیہ کے گھر پہنچا تو معلوم
ہوا کہ فوزیہ دفتر سے لوٹی نہ تھی۔ شنّو خالہ بیٹھی چاول چن
رہی تھیں۔ ان کا رویّہ کچھ عجیب اُکھڑا اکھڑا سا تھا۔

"شہلا کی شادی کب ہو رہی ہے؟" انہوں نے مجھ سے
پوچھا۔

"پتہ نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"ہاں تمہیں کیا پتہ ہوگا۔"

"کیا مطلب"

"تاریخ تو خالہ بی اور صفدر ہی طے کریں گے نا!"
انہوں نے کہا "کچھ تم سے پوچھ کر تھوڑے ہی طے کریں گے۔"

"فوزیہ کتنے بجے آتی ہے دفتر سے؟" میں نے پوچھا۔

"بس اتنا ہی ہو گی۔"

وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ جی تو چاہا کہ اٹھ کر چلا جاؤں۔ مگر فوزیہ کی شکل آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ اُسے دیکھنے کی خاطر ہی تو میں آیا تھا۔ کئی برسوں کے بعد میں ان کے گھر گیا تھا، مگر شنو خالہ نے چائے تک کیلئے نہیں پوچھا۔ مجھے غصہ تو بہت آ رہا تھا۔ مگر بے شرموں کی طرح بیٹھا رہا۔ چھ بجے کے قریب فوزیہ آئی۔ اُسے دیکھ کر ساری کوفت دُور ہو گئی۔ بہت ہی دھیمے مترنم لہجے میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ سُریلی گھنٹیوں کی آوازیں میرے پورے وجود کو متلاطم کرتی چلی گئیں۔

"امی آپ نے انہیں چائے پلائی نہیں" فوزیہ نے بہت ہی دھیمے لہجے میں شنو خالہ سے پوچھا۔

"ارے وہ ابھی تو آیا ہے۔" شنو خالہ نے کہا "میں نے سوچا تو آجائے پھر سب کے لئے ایک ساتھ بنا دوں گی۔"

"میں بنا لیتی ہوں" فوزیہ نے اُسی پست آواز میں کہا۔

"اے ٹھہر لڑکی! ابھی دفتر سے آئی ہے۔ آتے ہی چولہے میں گھسے گی کیا؟"

شنو خالہ بیزار ہو کر اُٹھیں مگر فوزیہ کچن میں جا چکی تھی کچھ دیر بعد وہ چائے کی پیالی لے کر آئی تو اُس کی لمبی لمبی انگلیوں پر میری نظریں جم گئیں۔

"شکریہ" کہتے ہوئے چائے کی پیالی میں نے اُس کے ہاتھوں سے لے لی، اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ میری موجودگی سے وہ یقیناً خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے بغور دیکھا۔ اس کا چہرہ کِھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"خالہ بی کیسی ہیں؟" فوزیہ نے پوچھا۔
"ٹھیک ہیں" میں نے جواب دیا۔ "تم بہت دنوں سے گھر نہیں آئیں۔"

"جی موقع نہیں ملا۔ شہلا تو مزے میں ہے نا۔ اُسے بھی ساتھ لیتے آتے۔"

"وہ فلم دیکھنے گئی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔
"صفدر فلم بنا رہے تھے اُس کا کیا ہوا" شنو خالہ نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولیں۔ "ہاں اب کیا بنے گی فلم"
شنو خالہ ہنسیں، ان کی ہنسی میں مجھے بڑی کڑواہٹ محسوس ہوئی۔

"یہ خالہ بی کیسے راضی ہو گئیں صفدر کے لئے" شنو خالہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں ان کی باتوں پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ مگر اُن کے کون منہ لگتا۔

"تمہارے گھر تو وہ برسوں رہا ہے" شنو خالہ کی کڑوی باتیں چلتی رہیں۔ "میں نے خود دیکھا ہے۔ ملازموں کی طرح رہتے ہوئے، شہلا کو گود میں لئے گھومتا رہتا تھا۔ کبھی سودا لا رہا ہے۔ کبھی انجنیر صاحب کے لئے سگریٹیں لا رہا ہے۔ کبھی تم دونوں کو بیچ لے جا رہا ہے، پھر کچھ اتنا بڑھا لکھا بھی نہیں۔"
شنو خالہ جی کے پھپھولے نکال رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا ابھی کچھ دیر اور بیٹھوں۔ فوزیہ کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہوں۔ لجائی لجائی سی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اپنی امی کی باتوں سے

اُسے بھی کوفت ہو رہی تھی مگر ایسی بڑی عورت کے سامنے زبان کھولنا بھی آفت تھی۔ مجھے غصّہ تو بہت آ رہا تھا۔ مگر میں ضبط کئے بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں میں کیا کہہ بیٹھوں۔ گفتگو کیا موڑ لے لے۔ یہ کہیں کوئی نئی آفت برپا نہ کر دیں۔ ان سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ میں اُٹھ گیا۔

"جا رہے ہو" شنو خالہ نے کہا "کچھ دیر بیٹھتے، کھانا نہیں کھاؤ گے۔" انہوں نے سپڑا ٹپکا۔ جیسے مجھے ہی ٹپک رہی ہوں۔

"ہاں، آپ روٹی کھا کر جائیے نا" فوزیہ کی مترنم آواز کانوں سے ٹکرائی۔

شاید میں رک جاتا مگر شنو خالہ کے خوف سے میں نے کہا۔

"نہیں مجھے کہیں جانا ہے۔"

"ہمارا کھانا بھلا ان کو کیوں پسند آئے گا" شنو خالہ کی جلی کٹی شروع ہو گئی۔ "بڑے لوگ ہیں نا، ہمارے گھر کھا لیں گے تو چھوٹے نہ ہو جائیں گے۔"

بتیس

گھر آیا تو معلوم ہوا کہ شہلا اب تک لوٹی نہیں ہے۔

آٹھ بج رہے تھے۔ امّی اور آپا بہت پریشان تھیں کہ صبح کی گئی لڑکی اب تک نہیں لوٹی تھیں خدا نہ کرے دشمنوں کو کچھ ہو نہ گیا ہو میں نے آپا سے کہا کہ کھانا کھالیں جب تک اور دیکھ لیتے ہیں۔ پھر میں خود اس کی سہیلی کے گھر جا کر پتہ کروں گا۔ روٹی کھا کر میں اٹھا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اُس کی سہیلی کا گھر تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بس پکڑ کر میں وہاں پہنچا۔ ان کے گھر پر دستک دی اُس کی سہیلی نے مجھے بتایا کہ وہ تو اس کے گھر آئی ہی نہیں۔ یہ سن کر مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا۔

"دوپہر میں تو اس نے گھر پر فون کیا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی ہے۔"

"وہ تو یہاں آئی ہی نہیں۔"

"پھر کہاں گئی ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں" اُس نے کہا۔

میں سڑک پر آکر سوچنے لگا کہ وہ کہاں ہوگی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ شہلا کا ارادہ کچھ اور تھا اُس نے جان بوجھ کر ہمیں فون کیا تھا۔ گھر آکر امّی کو میں نے بتایا تو وہ رونے لگیں۔ آپا کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے جاوید بھائی کو فون کر کے فوراً آنے کے لئے کہا۔ وہ بے چارے فوراً دوڑے دوڑے آئے۔

"کہیں میری بیٹی کو کچھ ہو نہ گیا ہو"۔ امّی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "فوراً پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں لکھواتے۔ تم لوگ

یہاں بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ ہائے میری بیٹی۔"

"اگر وہ خود گئی ہے تو پولیس میں رپورٹ لکھوانا مناسب نہ ہوگا کہیں کوئی اور پیچیدگی نہ پیدا ہو جائے" جاوید بھائی بولے۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کیا جائے۔ دل تو میرا بھی دھڑک رہا تھا کہ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ مگر زیادہ شواہد اس بات کے تھے کہ وہ دانستہ چلی گئی ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی قیمت پر صفدر بھائی کے ساتھ شادی نہ کرنا چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگا آخر کہاں گئی ہوگی۔ اس کی کئی سہیلیاں تھیں۔ پھر ہمارے رشتہ دار تھے، رشتہ داروں کے پاس تو اس کا جانا تقریباً ناممکن تھا۔ اگر وہ کسی سہیلی کے پاس گئی بھی ہوگی تو اس کا امکان کم تھا کہ وہ ہمیں بتا دے کہ شہلا ان کے گھر پر ٹھہری ہوئی تھی۔ پھر بھی جاوید بھائی کا خیال تو یہی تھا کہ کم از کم ایک چانس تو لے ہی لینا چاہیئے۔ ادھر امی ابا کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ میں نے سوچا اس فضا میں تو کچھ سوجھنے سے رہا پہلے باہر نکلنا چاہیئے۔

شہلا کی تمام سہیلیوں کے گھر جن کے پتے ہمیں معلوم تھے ہم ہو آئے، مگر کہیں شہلا کا پتہ نہ چلا۔ بار بار یہی خیال آتا کہ پولیس میں رپورٹ لکھا دیں پھر اچانک جاوید بھائی کو خیال آیا۔

"میرا ایک دوست ریلوے میں بکنگ کلرک ہے۔ چلو اس کے پاس چلتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔؟" میں نے پوچھا۔

"اگر شہلا کسی دوسرے شہر گئی ہے تو معلوم ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں" میں نے کہا۔ "اگر وہ آپ کا دوست ڈیوٹی پر نہ ہوا تو۔؟"

"چلو تو" جاوید بھائی نے کہا۔ "دیکھنے میں کیا حرج ہے۔؟"

"جاوید بھائی کا دوست تو ڈیوٹی پر نہ تھا مگر اس کا ایک ساتھی مل گیا۔ جو جاوید بھائی سے واقف تھا۔ بے چارہ فوراً مدد پہ آمادہ ہو گیا۔ کئی فہرستیں دیکھنے کے بعد ہم اٹھنا چاہتے تھے۔ مگر اس نے ہمیں روکا۔

"یار، تم لوگ اتنی جلدی ناراض کیوں ہو جاتے ہو" اُس نے کہا "بیٹھو چائے منگواتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے اُس نے دوسرے درجے میں سفر کیا ہو۔ ریزرویشن تو تھا نہیں اس کے پاس یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" اُس نے کہا "ممکن ہے۔ اس نے پہلے سے منصوبہ بنایا ہو۔ اور پھر دیکھ لینے میں کیا نقصان ہے؟"

"آپ کو خوامخواہ زحمت ہو رہی ہے" میں نے کہا۔ ویسے ہی ہم آپ کو کافی پریشان کر چکے ہیں۔"

"تم بھی یار کیسی باتیں کرتے ہو۔" اُس نے کہا۔ "دو چار فہرستیں ہی تو دیکھی ہیں، دو ایک اور دیکھ لیتے ہیں۔"

اس نے چائے منگوائی اور پھر مسافروں کی فہرست دیکھنے میں جُٹ گیا۔ بالآخر ایک فہرست میں اُس کا نام مل گیا۔

شہلا نے فرسٹ کلاس سے دلی کا ٹکٹ لیا تھا۔ اس خبر سے بڑی راحت ملی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محفوظ ہے

اور اُس کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ میں نے اور جاوید بھائی نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"نہیں یار اس میں کیا بات ہے، ہم کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ کا کام ہو گیا۔ ہمیں تو اس کی بڑی خوشی ہے۔"

جاوید بھائی اپنے گھر گئے۔ میں نے آپا اور امّی کو بتایا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ بیگم آنسو تھے کہ رُکنے میں نہیں آتے تھے۔

"بیٹے تم کل صبح ہی دلی چلے جاؤ۔"

"پر امّی دلی اتنا بڑا شہر ہے۔ اس کا پتہ چلانا کوئی آسان کام ہے کیا۔؟"

"تم تو پہلے ہی سے نحوست لگا دیتے ہو۔" امّی نے کہا "جاؤ تو کوشش کرو، ہو سکتا ہے مل ہی جائے۔ دلّی میں تمہارے تایا بھی تو رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہیں گئی ہو۔"

"اگر وہ واپس آنے پر تیار نہ ہوئی تو۔"

"اُسے لے ہی آنا سمجھا بجھا کر۔" امّی نے کہا "اس سے کہنا کہ وہی ہو گا جو وہ چاہے گی۔"

تینتیس

جاوید بھائی بے چارے صبح ہی آ گئے، نو بجے ہم لوگ پھر اسٹیشن گئے۔ وہاں جاوید بھائی کا دوست مل گیا، جس سے ملنے

ہم گزشتہ روز گئے تھے۔ اس نے فوراً ٹکٹ کا انتظام کروایا۔ گاڑی چلنے تک جاوید بھائی میرے پاس کھڑے رہے۔

گاڑی سرکنے لگی تو مجھ سے بولے فکر نہ کرنا بیٹے! میں روزانہ خالہ بی سے ملتا رہوں گا۔ تم جتنے دن چاہو رک جاؤ۔ کام پورا کر کے ہی آنا!

گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ پہلی بار میں نے ڈبے میں بیٹھے لوگوں کو ذرا توجہ سے دیکھا۔ میرے ساتھ کی سیٹوں پر چند نوجوان بیٹھے تھے؛ غالباً بغرض سیاحت نکلے تھے۔ خوش باش، مگن ہنستے بولتے چہلیں کرتے۔ جب بھی کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی اُن میں سے کوئی اتر کر پانی لاتا۔ کوئی اسٹیشن پر ٹہلنے لگتا۔ کسی کو سگریٹوں کی پڑ جاتی۔ کوئی چائے لے آتا۔ جب بھی وہ کھانے کی کوئی چیز خریدتے مجھے ضرور آفر کرتے۔ کبھی میں چکھ لیتا۔ کبھی انکار کر دیتا۔ دن بھر وہ کسی نہ کسی موضوع پر بحث کرتے رہتے۔ کبھی سیاست پر، کبھی کرکٹ پر، کبھی نجی تعلقات پر، تھک جاتے تو اخبار پڑھنے لگتے۔ چند موقعوں پر انہوں نے مجھے بھی اپنی بحث میں شریک کرنا چاہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔

دوپہر ہوتے ہوتے وہ بھی تھک گئے کوئی برتھ پر لیٹ گیا کوئی اوپر سلیپر پر جا لیٹا میں کھڑکی کے قریب جا بیٹھا۔ مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے بڑی تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ پھر ریل کی مسلسل چھک چھک۔ اپنے ماحول سے کٹ جانا مجھے کچھ دیر کے لئے ہی سہی بہت اچھا معلوم ہوا میں بڑی دلچسپی سے کھیتوں، مکانوں مویشیوں کو دیکھتا رہا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ ماند پڑنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور مکانوں پر آتی شام بڑی بھلی لگی۔ میں نے سوچا

زندگی کی شام بھی ایسی ہی خوش گوار معلوم ہوتی ہو گی۔

اس دوران میرے ساتھی اٹھ بیٹھے۔ دو ایک سلیپروں سے نیچے اتر آئے۔ اب انہیں چائے کی پڑی تھی۔

"ابے اگلا اسٹیشن کونسا ہے؟"

"پتہ نہیں، سالے میں کیا روز سفر کرتا ہوں کیا۔"

"بھائی صاحب، ابھی پچھلا اسٹیشن کونسا تھا؟"

میں مسکرایا۔ میرا اُس طرف دھیان ہی کہاں تھا۔

"ابے تو بھی کس سے پوچھ رہا ہے" ان میں ایک جو ذرا زیادہ بیباک تھا بولا۔

"وہ تو صبح سے اپنے ہی خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"معاف کرنا ہاں بھائی صاحب، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آپ بُرا مت ماننا۔ میری تو یونہی عادت ہے۔"

میں مسکرا کر رہ گیا۔

"اس سالے کی زبان کو لگام نہیں ہے۔" دوسرے ہنسے "کچھ نہ کچھ بکتا ہی رہتا ہے۔"

اگلے اسٹیشن سے ہم نے چائے پی۔ ایک سگریٹ بھی خرید کر پی۔

"یار ایسی بھی بے رخی کیا،" وہی نوجوان پھر بولا۔ "ہمیں پتہ ہوتا تو ہم خود سگریٹ پیش کرتے۔"

"بس یونہی کبھی کبھی پی لیتا ہوں" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"عادت نہیں ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔"

رات کے کھانے کا آرڈر میں دے چکا تھا۔ سات بجے سے ریلوے کینٹین والوں نے کھانا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سیلپر میں جا لیٹا۔ مگر نوجوان نے مجھے نیچے بلا لیا۔

"یہ غلط بات ہے" اُن میں سے ایک نے کہا "آج رات ہم آپ کو سونے نہیں دیں گے۔ آج کی رات تو آپ کو ہمیں دینی ہی ہو گی۔ پھر آپ سے کہاں ملاقات ہو گی۔؟"

"آئندہ ملنا کبھی نہیں؟" ایک نے بہت دھیمی آواز میں کہا اور قہقہہ لگا کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

ان میں سے ایک بہت اچھا گا لیتا تھا۔ اُس نے دو ایک فلمی گانے سنائے دو ایک غزلیں گائیں۔ پھر سب نے مل کر پھٹی ہوئی بے سُری آواز میں گانا شروع کیا۔ کسی نے ایک مکھڑا، کسی نے ایک آدھ انترا، کسی کی آواز بیچ میں بیٹھ جاتی۔ کچھ دیر کے لئے تو میں نے بھی خود کو فراموش کر دیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو جو اچھا گاتا تھا۔ اپنا مینا ڈیکا گانے کے لئے کہا۔ اور اس پر رقص کرنے لگا۔

"یار، تم تو چھپے رستم نکلے" ایک نوجوان نے کہا جس نے مجھ سے کہا تھا آئندہ مت ملنا Glad to meet you کہہ کر اُس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ لوگ بھی تھک چکے تھے۔ انہوں نے کہا بس یار اب اتنا کاریہ کرم بہت ہو گیا۔ اب کل دیکھا جائے گا۔ سب نے بستر کھولنے شروع کئے۔ میں بھی اوپر سیلپر میں جا کر

لیٹ گیا۔

اکیلے ہوتے ہی ایک بار پھر انہی تفکرات نے آگھیرا۔ کہاں گئی ہوگی وہ؟ میں نے سوچا تنہا لڑکی کو سو پریشانیاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ تایا کے گھر گئی ہوگی تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ وہ کسی کے ہاں ٹھہری ہوگی۔ کہیں کچھ ہو گیا یا غلط ہاتھوں میں پڑ گئی تو؟ وہ بولڈ BOLD تو ضرور تھی مگر تھی تو کمسن ہی۔ اُسے باہر کی دنیا کا اتنا تجربہ بھی کہاں ہے۔ پتہ نہیں کتنے پیسے ہوں گے اُس کے پاس، جو کپڑے، زیورات وغیرہ صفدر بھائی نے اُسے دلائے تھے وہ گھر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ ہر مہینے اُسے جو تھوڑا بہت جیب خرچ ملتا تھا وہ ضرور بچاتی تھی۔ بہت ہوا تو دو تین سو روپے ہوں گے اس کے پاس اتنے کم پیسوں میں کیسے کام چلے گا۔؟ خدا کرے وہ تایا کے گھر ہی گئی ہو۔ ریلوے اسٹیشنوں پر بھی تو غنڈے ہوتے ہیں۔ اکیلی لڑکی دیکھ کر پیچھے نہ پڑ گئے ہوں۔

ٹرین کے ... پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور تصورات اس قدر ہم آہنگ ہو چکے تھے کہ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو خیالات کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ نیند آنکھوں میں سمائی تھی مگر سخت سلیپر اور متواتر جھٹکے بھلا کیسے سونے دیتے؟ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند خوانچے والے، کچھ لڑکے پلیٹ فارم پر صدائیں لگاتے دوڑ رہے تھے۔

"چائے، گرما گرم چائے، پکوڑے، تازہ تازہ پکوڑے" کھڑکی کے قریب لیٹے ہوئے نوجوانوں میں سے ایک شاید جاگ رہا تھا۔ اُس نے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا اور مٹی کے کُلھیا میں چائے لے لی۔ پلٹتے ہوئے اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔

"چائے لیں گے آپ؟"

میں نے روپیہ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے چائے کی کُلھیا مجھے دی اور باقی ریزگاری بھی بڑھا دی۔

"آپ سوئے نہیں۔" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"نیند نہیں آ رہی۔"

"آپ کچھ ڈسٹرب معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسا تو کچھ نہیں، ریل کے سفر میں نیند کا مسئلہ تو ہوتا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے کہا "مگر آپ جب سے گاڑی میں بیٹھے ہیں کچھ فکرمند نظر آتے ہیں۔"

"نہیں، ایسا تو کچھ نہیں۔"

چائے پی کر اُس نے سگریٹ سلگائی۔ ایک سگریٹ میری طرف بڑھائی۔ سگریٹ جلا کر میں نے کروٹ بدل لی۔

اُسی وقت ہلکے سے ہچکولے سے ریل پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ شہلا آخر میرے متعلق کیا سوچتی ہوگی، جس خیال کو میں بڑی دیر سے ٹال رہا تھا۔ بالآخر ذہن کی تمام پرتوں کو توڑتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا۔ میرے متعلق اس کے جو بھی خیالات ہوں، اب تو پارہ پارہ ہو چکے ہوں گے۔ سب سے زیادہ شکایت تو اُسے مجھ سے ہی ہوگی۔ مجھ پر بھی کیا پاگل پن سوار ہوا تھا۔ مجھے تو شہلا کی پوری حمایت کرنی چاہئے تھی۔ میں کیوں خاموش رہا۔ صرف اپنے مفاد کے لئے؟ چھی چھی چھی۔ مجھے

اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔ لیکن میں کب شہلا اور صفدر کی شادی کی حمایت میں تھا؟ اُس سے میں نے گفتگو ضرور اس طرح کی تھی۔ مگر اُس وقت تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اگر شہلا نے میری گفتگو سے کچھ اور نتیجہ نکالا تو ظاہر ہے وہ اور کیا کرتی۔ بہر حال اس اقدام سے اُس نے مجھے ایک ناگوار فیصلے سے بچا لیا تھا۔ ذہنی طور پر میں خود یہ چاہتا تھا کہ حالات خود کوئی ایسا موڑ اختیار کریں کہ مجھے فیصلے کے عذاب سے نہ گزرنا پڑے۔ ایک طرح سے اُس نے میرے دماغ سے ایک بڑے بوجھ کو اُتار دیا تھا۔ خود فوزیہ مجھے کس قدر خود غرض سمجھتی ہوگی۔ کیا پتہ اس کے دل میں میرے لئے محض احترام کے اور کچھ نہ ہو۔ ممکن ہے میں نے اُس کی نگاہوں کو غلط سمجھا ہو۔ اس سلسلے میں ہماری کبھی کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ ہماری شادی گھر والے طے کرنا چاہتے تھے اور اُس کی خاموشی رضامندی کی دلیل تھی۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی رضامندی محض اس لئے ہو کہ اس وقت اور کوئی بہتر اُمیدوار اس کی نظر میں نہیں تھا۔ ہماری شادی کامیاب ہی ہوتی یہ کون کہہ سکتا تھا۔ رہتے تو ہم صفدر کے دستِ نگر ہی۔ کیا پتہ وہ بھی انہی آسائشوں کی خواہشمند ہو۔ جو صرف صفدر ہی دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنے والدین پر غصہ آنے لگا۔ مجھے انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ جو خواہش ظاہر کی پوری کر دی۔ جو چیز مانگی فوراً مل گئی۔ میری حالت پالتو کبوتروں کی سی تھی۔ جو مختصر سی اُڑان کے بعد دوبارہ اپنی کابک میں لوٹ آتے ہیں اور اسی میں مگن رہتے ہیں۔ بچپن کی عادتیں مجھ میں اس قدر سرایت کر گئی تھیں کہ بالغ ہوتے پر بھی میں چاہتا تھا کہ میں آرزو کروں اور دوسرے اُس

کی تکمیل کریں۔ موہن کمار نے آسرا دیا۔ میں ٹوڈی کے چکر لگانے لگا۔ صفدر نے منیجر بنانے کا وعدہ کیا۔ میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ خود اعتمادی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی سکت مجھ میں نہیں آئی۔ دلّی کے اس سفر کا بھی کیا حاصل ہوگا، وہاں جا کر میں کروں گا بھی کیا؟ یہی باتیں سوچتے سوچتے آخر میں سو گیا۔

تایا کے گھر پہنچا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کم از کم اس وقت مجھے یہی لگا تھا۔ جب میں نے انہیں شہلا کی روانگی کے متعلق بتایا تو انہوں نے مزید حیرت ظاہر کی۔ اپنے لڑکے راشد کو میرے ساتھ کر دیا۔ اُسے لئے میں نے دلّی کے تمام ہوٹل چھان مارے۔ تین دن تک ہم سڑکوں، پارکوں تفریحی مقامات اور ہوٹل کے چکر لگاتے رہے۔ مگر شہلا کا کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر تایا نے مجھ سے وعدہ کیا کہ شہلا کو تلاش کرنے کی ہم پوری پوری کوشش کریں گے۔ چچی نے اور ان کے لڑکے راشد نے بھی مجھ سے کہا کہ تم فکر مت کرو، اپنی امّی سے کہو کہ یہاں ہم اُسے ڈھونڈ کر ہی رہیں گے۔

چوتھے روز میں دلّی سے لوٹا۔ گھر پہنچا تو وہی سوگواری، ویرانی طاری تھی۔ امّی اور ابا کے چہرے ان پانچ سات دنوں میں ایسے اُتر گئے تھے مانو برسوں کی مریض ہوں۔ جاوید بھائی اس دوران برابر امّی سے خیر خیریت معلوم کرتے رہے۔

میری وجہ سے اُس کی زندگی تباہ ہوئی، امی اِسی جملے کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ میں پہلے ہی منع کر دیتی تو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ ہم نے اس بے چاری کو کون سی خوشی دی۔ اس بے چاری کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہمیشہ بس منّے کا ہی سوچتے رہے۔ بیٹا تم نے بھی اُس کا خیال نہ رکھا۔

اس آخری جملے پر میرا کلیجہ پھٹ جاتا تھا۔ ہر وقت میرے ذہن میں سوئیاں سی چبھتی رہتیں، اُٹھتے بیٹھتے میرے ذہن میں بس یہی جملہ کوندتا رہتا۔ بیٹا تم نے بھی اس کا خیال نہیں رکھا۔ کئی بار جاوید بھائی نے ٹوکا۔ یار یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ اٹھو داڑھی بناؤ، کپڑے تبدیل کرو۔ باہر چلتے ہیں۔ ذرا طبیعت سدھر جائے گی۔ کئی بار موہن کمار نے بلایا۔ ایک بار گھر پر آکر ساتھ میں بھی لے گیا۔ ان کی جاوید بھائی اور جوشی کی اچھی گھٹ رہی تھی۔ دل کچھ ایسا بجھا کہ کسی بات کا اثر ہی نہ تھا۔ امی کا جملہ ذہن میں گونجتا رہتا۔ سر میں ہر وقت گرانی سی رہتی۔ کبھی کبھی بے حد شدید درد اٹھتا۔ جو سردرد کی ٹکیاں لینے پر بھی دُور نہ ہوتا۔ دھیان بٹانے کے لئے دو ایک بار دوستوں میں بھی گیا، مگر طبیعت ایسی سرد ہوئی تھی کہ ابھر نہ سکی۔

ایک شام شنّو خالہ آئیں۔ صفدر بھائی کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کا رقعہ لے کر۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔

"کیا حالت بنالی ہے تم لوگوں نے" شنّو خالہ بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے بولیں "اچھے ہنستے بولتے گھر کو اُس باولی لڑکی نے

کیسا اجاڑ بنا رکھا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگی، خوش ہی ہوگی۔ تم لوگ کیا اس کے لئے اپنی جان دے دو گے۔؟"

امی بے چاری کیا بولتیں۔ چپ سنتی رہیں۔

"ذرا گھر سے باہر نکلو،" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا، جو ہوا سو ہوا اب رونے سے کیا فائدہ۔ خود کو سنبھالو۔ گھر تو اب تم کو ہی سنبھالنا ہے۔ میں صفدر سے کہہ دوں گی۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کام دے دے۔ شادی کا تھوڑا کام کاج ہی بٹا دو۔ صفدر کے پاس تو سینکڑوں آدمی ہیں۔ ایک ایک کام کو پچاس آدمی دوڑتے ہیں۔ مجھے تو تم لوگوں سے امید تھی۔ بیٹا تم ہی آجاؤ۔ جاوید کو بھی لیتے آؤ۔ نگوڑے مارے کو سوائے فلموں کے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ کوئی مرے یا جیے اُس کی بلا سے۔"

"آجاؤں گا۔" دل پر پتھر رکھ کے میں نے کہا۔

شنو خالہ کے جانے کے بعد میں نے سوچا فوزیہ کیسے راضی ہوگئی، اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ شہلا کی طرح گھر چھوڑ کر نکل جائے ویسے بھی بات کرتی تھی تو چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگتے تھے۔

چونتیس

اگلے روز میں شنو خالہ کے گھر گیا۔ وہ مانجھے میں بیٹھی تھی۔ رشتے کی کئی بہنیں، دوسری لڑکیاں اُس کے گرد جمگھٹا لگائے بیٹھی

تھیں۔ میں یونہی اپنی رشتے کی بہنوں سے باتیں کرنے لگا۔

فوزیہ نے جھک کر ایک لڑکی سے کہا۔

"منّے بھائی کے لئے چائے تو لے آ"

وہ اُٹھی تو اُس کے ساتھ دو تین لڑکیاں یونہی اُٹھ گئیں۔ ایک سے میں نے پانی لانے کے لئے کہا۔ دو ایک اُس کے ساتھ چلی گئیں۔ دو ایک لڑکیاں رہ گئیں تھیں۔

چُپ چاپ بیٹھے بیٹھے شاید وہ بھی اُوب گئیں یا شرما شرمی میں اُٹھ کر چلی گئیں۔

تنہائی تو نصیب ہوئی۔ مگر گفتگو کیا ہو؟

"آپ ہمیں کسی طرح یہاں سے لے جایئے" اچانک اُس نے سر جھکا کر کہا اور سسکیاں لیتے ہوئے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

"ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"تم نکل بھی سکو گی۔؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، آپ جہاں بھی کہیں گے ہم آجائیں گے۔" اُس نے کہا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور بات ہوتی دو لڑکیاں پانی لے کر آگئیں، ان کے آتے ہی پھر جمگھٹا جمنا شروع ہو گیا۔

میں چائے پی کر شنو خالہ کے پاس چلا گیا۔

"کپڑے وغیرہ آگئے" میں نے پوچھا۔

"کپڑے کچھ تو پہلے سے بنے رکھے تھے، کچھ کل لے آئی۔ آئس کریم کا آرڈر بھی صفدر نے دے دیا ہے۔ جہیز کے لئے صفدر نے خود ہی منع کر دیا ہے۔ فرنیچر وہ خود بنوا رہا ہے۔ انٹیریر ڈیکوریٹر کیا،

وہ کیا کہتے ہیں، اُس سے کام بنوا رہا ہے۔ ہم کچھ دیں گے تو بے جوڑ معلوم ہوگا نا۔"

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔

"شہلا کا کچھ پتہ چلا"، ستّو خالہ نے کہا۔

میں نے سر کے اشارے سے نہ کیا۔

"یہ آج کل کی لڑکیوں کو بھی پتہ نہیں کیا ہو جا رہا ہے۔"

انہوں نے بڑی اونچی آواز میں کہا۔ جیسے چاہتی ہوں سب سن لیں۔

"تو میں چلوں" میں نے کہا۔

"جاؤ، مگر آتے رہنا، پتہ نہیں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

شام میں جاوید بھائی آ گئے۔ اُن سے میں نے اپنی اور فوزیہ کی گفتگو سنائی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے" جاوید بھائی نے پوچھا۔

"آپ ہی بتایئے" میں نے کہا "شہلا کا داغ تو مجبوری ہے ہی ایک اور لڑکی کو اس جہنم میں کیسے جھونک دوں"

"تو کیا کروگے۔؟"

"کہیں لے کر نکل جاتا ہوں اور کیا" میں نے کہا۔

"کہاں لے جاؤ گے؟"

"کہیں بھی چلا جاتا ہوں، گوا کو نکل جاتا ہوں؟"

"وہاں کون ہے؟"

"ایک کالج کا دوست ہے میرا"

"اور خرچ کا کیا کرو گے" جاوید بھائی نے کہا "دو آدمیوں میں کم از کم سات آٹھ سو روپے تو چاہیئے۔ پھر کیا دوست کے گھر مستقل رہو گے۔؟"

"آپ تو میرا حوصلہ پست کئے دے رہے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"میں تو صرف وہ باتیں بتا رہا ہوں جو تم بعد میں سوچو گے۔ اور اس وقت تمہیں فوزیہ پر غصہ آئے گا کہ یہ جنجال میں نے کہاں مول لیا"

"جاوید بھائی سات آٹھ سو روپے کی نوکری تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ لوگوں کو تین چار سو روپے کی نوکری نہیں ملتی تمہیں کیسے مل جائے گی؟"

"تو پھر نہ لے جاؤں فوزیہ کو؟" میں نے کہا۔

"یہ میں نہیں کہتا۔" جاوید بھائی نے کہا "مگر سوچ لو۔ خوامخواہ تمہاری اور لڑکی کی زندگی تباہ نہ ہو جائے۔"

جاوید بھائی کی باتوں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ دن نکلتے گئے، دل میں کچھ کر جانے کا حوصلہ ابھرا تھا وہ جاوید بھائی کی باتوں نے پست کر دیا۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا کہ اب تو شادی کے رقعے بھی تقسیم ہو چکے ہیں۔ اب اگر میں نے کچھ کیا تو صفدر تو پاگل ہو جائیں گے۔ ممکن ہے انتقام پر اتر جائیں غنڈہ گردی میں ان کو کون پورا پڑ سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں خاص شادی کا دن آ گیا۔

شادی کی صبح صفدر بھائی خود گاڑی لے کر آئے شاندار موڈ میں تھے۔ امی اور آپا کو لینے آئے تھے۔

"جانے دو خالہ بی" انہوں نے کہا "جو ہوا سو ہوا۔ آپ کے گھر کا میں نے نمک کھایا ہے۔ شادی میں میری طرف سے تو آج آپ ہی رہیں گی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ شہلا ایسی ناسمجھ نکلے گی۔ خیر آدمی کو دل بڑا رکھنا چاہئے۔ منے تم کیا کرو گے یہاں بیٹھ کر۔ تم بھی چلو۔"

"مجھے جاوید بھائی کے ساتھ ذرا اسٹوڈیو جانا ہے۔" میں نے کہا

"تو شام کو تو آ رہے ہو نا۔"

"ہاں شام میں آ رہا ہوں، تین بجے تک آجاؤں گا۔"

"دیکھو بھولنا نہیں۔ دوپہر کا کھانا گھر پہ کھانا، مہمانوں کا استقبال تمہیں اور جاوید کو ہی کرنا ہے۔"

امی کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔ سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹکیا بھی لی مگر درد میں افاقہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔

دوپہر میں جاوید بھائی آگئے۔

"یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے۔" انہوں نے کہا "سر کا درد اور بڑھتا جائے گا۔"

میں نے اٹھ کر کپڑے بدلے۔ اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

صفدر بھائی کے گھر بڑا ہنگامہ تھا۔ پورا محلہ سجا ہوا تھا۔ فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ رشتہ داروں کا تانتا بندھا تھا۔ ماحول خوشبو سے مہک رہا تھا۔ خوبصورت نوجوان لڑکیاں اور عورتیں

قیمتی ساڑیوں، قمیضوں، شلواروں میں ملبوس خوب میک اپ سے چہرہ کسے ٹیکسیوں سے اترتیں اور غلط انداز نظریں ڈالتی ہوئی بے نیازی سے گزر جاتیں۔ کمسن نازک اندام نوخیز لڑکیاں خوامخواہ ہی اگر شوخیاں کر جاتیں۔ اُن کا نشانہ جاوید بھائی اور ہم ہی تھے۔ جیسے وہ اپنی خوشیوں میں ہمیں بھی شریک کرنا چاہتی ہوں۔

چھ بجے ہم صفدر بھائی کو لے کر ہال پر پہنچے۔ دلہن اب تک آئی نہ تھی۔ کچھ دیر ہال میں ہم ادھر اُدھر ٹہلتے اور مختلف شناساؤں سے ملتے رہے تاکہ بعد میں کسی کو شکایت نہ ہو۔ پھر مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم دروازے پر کھڑے ہو کر مہمانوں کا استقبال کرنے لگے۔ سات بجنے میں تھوڑی دیر تھی کہ ایک گاڑی پھولوں سے سجی دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ دلہن آگئی، شور ہوا اور ہال میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی۔ میں نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ جاوید بھائی ساتھ میں تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ اس گاڑی میں سب عورتیں ہی تھیں۔ دو تین لڑکیوں نے فوزیہ کو گاڑی سے اُتارا۔ اس کی آنکھیں قریب قریب بند تھیں۔ سجی سنوری شادی کے سرخ جوڑے میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ پہلی اور آخری بار میں اُسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا، مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ میں نے جاوید بھائی سے کہا۔ ملازم شربت کے گلاس لیے جا رہے تھے۔ جاوید نے ایک گلاس لے کر فوزیہ کی سہیلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سمجھی شاید یہ بھی

کوئی رسم ہے۔ اُس نے کہا۔

"منّے بھائی آپ ہی پلائیے نا۔"

میرا نام سُن کر اس کی آنکھیں یکبارگی کھُلیں، کچھ ثانئے مجھے دیکھتی رہیں، پھر بند ہوگئیں۔ وہ نگاہیں! اُف، اُن نگاہوں میں کتنا درد تھا۔ التجا تھی کہ مجھے بچالو۔ گھبرائی سہمی وہ نگاہیں میرے کلیجے میں پیوست ہوگئیں۔ پتہ نہیں میں نے کیسے فوزیہ کو شربت پلایا۔ فوراً بعد ہی عورتیں اُسے لے گئیں۔

اِس کے بعد مجھ سے وہاں رُکا نہیں گیا۔ تپش سے میرا بدن جھلسنے لگا تھا۔ گھر آکر کپڑے بدلے بغیر میں بستر پر لیٹ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ کپڑے بدلتا۔ درد کی لہریں جنھیں میں قریب قریب فراموش کر چکا تھا۔ پہلے سے زیادہ شدت سے عود کر آئیں۔ میرے دماغ سے جیسے دہکتی ہوئی گرم سلاخیں گزر رہی تھیں، درد کی شدّت سے شاید میں چیخنے لگا۔ امّی اور آپا شادی سے لوٹیں تو جاوید بھائی انہیں چھوڑنے آئے تھے بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ لوگ لوٹے تب بھی میں درد کی شدّت سے تڑپ رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے فوراً ہسپتال لے گئے۔ اگلے روز کچھ افاقہ ہوا۔ مگر سر میں درد کی ٹیسیں برابر اٹھتی رہیں۔ دو ہفتوں تک چیک اپ ہوتا رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ دماغ میں ناسور ہوگیا ہے۔

امّی ہر وقت پائینتی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں۔

اِس وقت بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ میری پائینتی سے لگی بیٹھی ہیں۔ یہ اچانک اجالا سا کیوں پھیل گیا ہے؟ یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے؟ ارے یہ تو شہلا ہے۔ اچھا ہوا تم لوٹ آئیں۔ تم خوش تو ہو نا میری بہن؟ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا بہت گنہ گار ہوں۔ ارے تم تو دلہن بنی ہوئی ہو۔ تمہارے ساتھ یہ کون ہے۔ یہ تو راشد ہے نا؟ تم دلّی سے کب آئے، آخر ڈھونڈ لیا نا تم نے شہلا کو۔ ہاں منّے بھائی یہ دلہن ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔

شہلا نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اور درد کی لہریں اچانک کم ہو گئیں ہیں۔

"منّے بھائی" اس کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ سب کو دیکھ رہا ہوں۔ امّی، آپا، جاوید بھائی، شہلا، اس کا شوہر اور ــــ ارے یہ تو فوزیہ ہے!

"مجھے معاف کر دینا فوزیہ"۔ میں نے کتنے رسان سے کہہ دیا ہے۔ وہ رو پڑی ہے۔ میں تم سب کا گنہگار ہوں۔ امّی مجھے معاف کر دینا۔ میں تم لوگوں کے کسی کام نہ آسکا۔

"منّے"، امّی کی چیخ۔ یہ آخری آواز تھی جو میرے ذہن میں محفوظ ہوئی۔ درد کی لہریں کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئیں،

ہر طرف سکون ہے اور اندھیرا۔

"میں تیار ہوں۔" مگر یہ میں کس سے کہہ رہا ہوں؟ پرت اندر پرت سکون نے اب مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

●●

ختم شد

بمبئی

شہر نگاراں

جہاں زندگی، ہر صبح ایک نیا سپنا پلکوں پر سجا دیتی ہے

ساحل سمندر پر بسا خوبصورت شہر،

جس کی جگمگاتی روشنیاں،

ہر لحظہ ایک نیا خیرہ کن سراب پیدا کرتی ہیں

سراب زدہ، پھول جیسے لوگوں کی کہانی

انور خان کے منفرد قلم سے

جنہیں زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کو، سادگی و پرکاری، اختصار و دلچسپی

کے ساتھ خوبصورت نثر میں بیان کرنے کا ہنر آتا ہے

یہ طرز، یہ اندازِ سخن ہم سے چلا ہے

۴۰۷، فراش خانہ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶